گمان اور اے غزالِ شب میں سقوطِ سوویت یونین کے اثرات

(تجزیہ و مطالعہ)

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اردو)

مقالہ نگار:

وسیم عباس

رجسٹریشن: 164-FLL/MSURDU/F15

نگران:

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

Acc # TH 20441

MS
891.4393
وس ل

اردو ادب - شاعری

تجزیاتی مطالعہ

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں MS اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"گمان اور اے غزالِ شب میں سقوطِ سوویت یونین کے اثرات (تجزیہ ومطالعہ)"**

مقالہ نگار: وسیم عباس

رجسٹریشن نمبر: 164-FLL/MSURDU/F15

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر منور اقبال احمد
ڈین
کلیہ زبان وادب

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

ڈاکٹر رشید امجد
ریٹائرڈ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر حمیرا اشفاق
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

ستمبر، 2018ء

اقرار نامہ

میں، وسیم عباس، رجسٹریشن نمبر 164-FLL/MSURUD/F15 حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ،اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج) کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا اور میرا یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔

Abbas
(وسیم عباس)

مقالہ نگار

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

فہرست ابواب

نام ابواب	صفحہ نمبر
پیش لفظ	i
باب اول: اشتراکیت: سوویت یونین۔ آغاز تا سقوط	۱
باب دوم: گمان اور لے غزال شب کا تعارفی مطالعہ	۳۹
باب سوم: گمان میں مارکسی تصورات اور پاکستانی سماج	۶۸
باب چہارم: لے غزال شب میں سقوط سوویت یونین کے بعد سرمایہ داری کا ظہور	۸۵
باب پنجم: گمان اور لے غزال شب میں سقوط سوویت یونین کا تقابلی جائزہ	۱۱۸
ماحصل	۱۵۳
کتابیات	۱۶۰

پیش لفظ

یہ بات درست ہے کہ ایک انسان کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ میں نے بھی بچپن میں اپنی ماں سے بہت سی کہانیاں سنی اور اسی کے سبب میں خود سے اُردو پڑھنے کے قابل بھی ہو گیا۔ پھر میرا زیادہ وقت اخباروں ،ڈائجسٹوں اور تعلیم و تربیت میں موجود کہانیاں پڑھنے میں صرف ہونے لگا۔

عملی زندگی کا آغاز ہوا تو زندگی کے معانی بھی بدلے ہوئے محسوس ہوئے۔ایسے میں پاکستان ریلوے کیرج فیکٹری میں بطور دیہاڑی دار ورکر کام کرنا پڑا۔لیکن خوش قسمتی بھی تھی کہ اسی دوران مجھے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ایم اے کی سطح پر داخلہ مل گیا۔میرے استاد محترم جناب ڈاکٹر ارشد معراج صاحب نے مجھے میکسم گورکی کا ناول ماں پڑھنے کو دیا تو مجھ پر زندگی کے معانی آشکار ہونے لگے اور یوں محسوس ہوا جیسے اس میں کسی نے میری ہی زندگی کے رنگ کو بیان کر دیا ہے۔میکسم گورکی کا ناول ماں پڑھنے سے مجھے نہ جانے یہ احساس کیوں ہونے لگا کہ جیسے میں کسی اور جنم میں بھی کیرج فیکٹری میں کام کر چکا ہوں۔اس ناول کے کردار بھی مجھے اپنے دوست محسوس ہوئے جو کیرج فیکٹری میں میرے ساتھ ہیں''اپنی نظر میں دن بھی اندھیری رات ہے''۔ یا ایسا محسوس ہوتا جیسے ناول نگار مجھ سے بھی پہلے اس کیرج فیکٹری کے حالات و واقعات کو دیکھ چکا ہے جسے وہ باقی لوگوں کے لئے ناول کی شکل میں محفوظ کر گیا ہے۔اس کے بعد میں ادب کا با قاعدہ مطالعہ کرنے لگا اور میں نے اے غزالِ شب اور گمان کا مطالعہ کیا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور آخر کار میں نے اپنے موضوع کے لئے گمان اور اے غزالِ شب کا تقابلی موضوع منتخب کیا۔

باب اوّل میں اشتراکیت کے عروج وزوال کی داستان کو بیان کیا ہے جس میں اس تحریک کا آغاز ،درمیان اور اس کا انہدام ہونے کے اسباب کو اس کے حقیقی اور تاریخی پس منظر میں پرکھا ہے۔اسی باب میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کی مختصر سوانح بھی بیان کر دی گئی ہے جو اس تحریک کے بانیوں میں شامل تھے۔اس باب کے مطالعہ کے لئے داس کیپیٹل ،جمہوریہ،خاندانی ذاتی ملکیت اور ریاست،موسیٰ سے مارکس تک ،تاریخ کا نیا موڑ ،مارکسی فلسفہ اوریورپ امیر کیسے بنا جیسی کتب کو مدِنظر رکھا گیا۔

باب دوم میں گمان اور اے غزالِ شب کا تعارفی مطالعہ بیان کیا گیا ہے جس میں ان دونوں ناولوں کے مصنف، کہانی، کردار، موضوع، اُسلوب، اور پلاٹ کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس باب میں ان ناولوں پر لکھی گئی کتب کو

بھی شامل بحث بنایا گیا ہے تا کہ مفہوم کی تفہیم کا مسئلہ نہ رہے۔

باب سوم میں گمان میں بیان کیے گئے مارکسی تصورات اور پاکستانی سماج کا بھرپور اور موثر انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔اور یہ عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس تحریک کو پاکستانی سماج میں پذیرائی کیوں نہ مل سکی اور کن مسائل کی وجہ سے اس تحریک کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ باب اس لئے بھی اہم تھا کہ اس میں پاکستان کی سیاسی تاریخ کے بعض پہلوؤں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے اور مولانا کوثر نیازی کی کتاب دیدہ ور: ذوالفقار علی بھٹو بھی مطالعہ رہی۔

باب چہارم میں اے غزالِ شب میں سقوط سوویت یونین کے بعد سرمایہ داری کے ظہور، فطرت اور نوعیت کو بیان کیا ہے۔

باب پنجم میں گمان اور اے غزالِ شب کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں دونوں ناولوں میں پائے جانے والی مشترکہ خصوصیات، موضوع، کردار، سوویت یونین کی شکست اور سرمایہ داری کی جیت اور اس کے بعد کی صورت حال کو عمدہ اُسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس موضوع کی علمی ادبی حیثیت کا تعین ذوقِ مطالعہ لوگوں پر چھوڑا گیا ہے۔

آخر میں اپنے نگران محترم ڈاکٹر ارشد معراج کا خصوصی ممنون ہوں جن کی مدد ہر مشکل گھڑی میں میرے ساتھ ساتھ رہی اور ہر لمحے میری رہنمائی کی جن کی بدولت اس مقالے کی تکمیل ممکن ہو سکی۔

اس موقع پر میں اپنے دوسرے اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرنا بھی نہیں بھول سکتا جنہوں نے مقالے کی تسوید کے دوران پیش آنے والی مشکلات میں میری رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔خصوصی طور پر ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر کامران کاظمی، ڈاکٹر مظہر علی، ڈاکٹر اسماعیل گوہر اور جناب فرخ ندیم کا بہت ممنون ہوں۔

والدین کا شکریہ بھی لازم ہے جو دن رات میری کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہتے ہیں۔اس کے علاوہ اپنے دوستوں محمد سہیل اقبال، اسلام بہادر، محمد امجد اور علی حسین کے تعاون کو بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

آخر میں ایک بار پھر اپنے نگران ڈاکٹر ارشد معراج صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کی صحت اور خوشی کے لیے اللہ سے ہمیشہ دعا گو ہوں (آمین)۔

وسیم عباس

۲۸ مئی ۲۰۱۸ء

باب اول

اشتراکیت: سوویت یونین - آغاز تا سقوط

(اجمالی جائزہ)

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے سرمایہ داری نظام کو جنم دیا۔ جس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب برپا ہو گیا۔ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے اور نئے صنعتی معاشرے کے قیام نے جہاں عام انسان کو بے شمار سہولیات فراہم کیں، روزگار کے دروازے کھولے وہاں مختلف تضادات کو بھی ابھارا۔ ان تضادات میں سب سے بڑا تضاد آجر اور مزدور میں بڑھتا ہوا تفاوت تھا۔ کارل مارکس پہلا دانشور تھا جس نے مزدور طبقے کے لیے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا اور ان کے استحصال کے لیے ایک نظریہ پیش کیا جو 'قدرِ زائد' کے نام سے پیش کیا گیا۔ اس نے ''داس کیپیٹل'' کے نام سے کتاب لکھی جو سرمایہ داریت کے لئے زہر قاتل بنی۔ مارکس اور اینگلز نے اشتراکیت کا نظریہ پیش کیا جس میں طبقاتی کشمکش کو اجاگر کیا گیا۔

بیسویں صدی ایک لحاظ سے ہنگامہ خیز صدی تھی اس میں تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوا، تاریخ انسانی میں اس سے قبل ایسی مثالیں نہیں ملتی۔ ایک طرف دو عظیم جنگوں نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا تو دوسری طرف دنیا بھر کے مزدوروں نے سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا۔ کارل مارکس کی معاشی تھیوری پر سب سے پہلے روس میں انقلاب برپا ہوا، جو کہ ایک زرعی سماج تھا جس نے دنیا بھر کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو چونکا دیا اور انہوں نے اس نظام کو ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی اس انقلاب نے نہ صرف دنیا کے سیاسی منظر نامے کو بدلا بلکہ سماج اور ادب نے بھی اس سے گہرے اثرات قبول کیے برصغیر کا خطہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

1990ء کی دہائی میں جب سویت یونین کا زوال عمل میں آیا تو یہ ملک سرمایہ داروں کے لیے بہترین منڈی بن گیا۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح اردو ادب بھی اس کے براہ راست اثرات مرتب ہوئے۔ سویت یونین کے زوال پر اردو میں مضامین تو لکھے گئے، لیکن تخلیقی سطح پر اس کا اظہار بہت کم ہوا۔ ارشد وحید نے اپنے ناول گمان (1985) میں اور مستنصر حسین تارڑ نے اے غزال شب (2013ء) میں تخلیقی سطح پر سقوطِ سویت یونین سے پیدا ہونے والے حالات کی ناول کی شکل میں عکاسی کی ہے۔

اشتراکیت نہ صرف معاشی نظام ہے بلکہ اس میں طبقات کی بقا اور جدلیاتی مادیت کارفرما ہے۔ اس لئے سرمایہ داروں کو اس سے خوف آتا رہا ہے۔ دنیا میں سب سے پہلا اشتراکی انقلاب اکتوبر 1917ء میں روس میں آیا۔ روس میں بالشویک حکومت نے آہنی دیوار قائم کر دی اور لینن کی قیادت میں سویت یونین کا قیام عمل میں آیا۔ اس نظام میں جہاں بہت سی کو خوبیاں تھیں وہاں کچھ خامیاں بھی تھیں جن سے عالمی سرمایہ دار ملکوں نے فائدہ اٹھایا

اور سویت یونین کا سقوط عمل میں آیا۔ مزدروں کے حقوق کو تسلیم کیا جانے لگا۔ اور انہیں سوشل سیکورٹی کی سہولت ان کے بچوں کو مفت تعلیم، صحت کی سہولیات بے روزگاری الاؤنس تک دیا جانے لگا تا کہ اشتراکی انقلاب کا راستہ روکا جا سکے۔

امریکہ اور سویت یونین میں سرد جنگ کا ایک طویل دورانیہ ہے جو سوویت ریاستوں کے علیحدہ ہونے تک جاری رہا، اشتراکی انقلاب صرف روس میں ہی نہیں آیا بہت سے ممالک جیسے، لیبیا، کیوبا، مشرقی یورپ، شمالی کوریا اور چین اس نظام سے متاثر ہوئے۔ مذکورہ موضوع میں دیکھا جائے گا کہ اردو ناول میں سوویت یونین کے زوال کی عکاسی کیسے کی گئی ہے۔ گمان اور اے غزال شب دونوں اہم ناول ہیں۔ کیونکہ ان ناولوں میں جو موضوع زیر بحث ہے وہ اس انداز میں اردو ناول کی تاریخ میں پہلی مرتبہ آیا ہے۔ یہ بات حقیقت بھی ہے کہ اشتراکیت پسندوں کے ساتھ پاکستان میں سیاسی و سماجی سطح پر جہاں بے شمار نشیب و فراز آتے رہے ہیں وہاں ذہنی و نفسیاتی سطح پر بھی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہتی ہے۔ خصوصاً اس نسل کی جنھوں نے انقلاب کے خواب دیکھے اور معاشرے کو تبدیل کرنے کی ٹھان لی۔ جب سویت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہوا تو ان کے خواب چکنا چور ہو گئے اور ذہنی و نفسیاتی کرب ان کے لیے سوہان روح بن گیا۔ اس نسل کے کئی افراد ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ جو پاکستانی سویت یونین کے عروج کے زمانے میں وہاں گئے تھے اور زوال کے بعد سرمایہ داریت کے تحت طوائف پرستی، فحاشی و عریانی بے روزگاری اور کساد بازاری کا جب سیلاب آیا تو یہ نسل ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اور پاکستان آ کر معمول کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکی۔ ان حوالوں سے دیکھا جائے تو مذکورہ دونوں ناول اہمیت کے حامل ہیں اس لیے انہیں تحقیق و تنقید کا موضوع بنانے کا ارادہ کیا گیا ہے۔

چونکہ میرا موضوع سقوطِ سویت کے حوالے سے ہے اس وجہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ پہلے ہم کمیونزم کو سمجھیں۔ اس باب میں اشتراکیت کی روایت، اکتوبر 1917ء انقلاب تا سقوطِ یونین کو دیکھا گیا ہے۔

اشتمالیت کی روایت

انسان شروع سے ہی ایک ایسے معاشرے کا خواہش مند رہا ہے کہ جس میں اس کی ضروریات احسن طریقے سے پوری ہوں۔ عورت اور مرد کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ امیر و غریب کی تفریق نہ ہو۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اور طبی امداد کے ایک جیسے مواقع میسر ہوں۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اپنے جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ

آزادانہ ماحول میں کر سکے۔ قانون کی نظر میں حاکم ومحکوم برابر ہوں تا کہ سکون وشادمانی کی زندگی گذار سکے۔ جیسا کہ شروع میں بیان ہوا ہے کہ قدیم اشتمالی معاشرے میں نجی ملکیت کا تصور نہ تھا۔ خوراک، لباس اور ٹھکانے میں افراد با ضابطہ بالظابطہ برابر کے شریک تھے۔ املاک مشترکہ تھی اور پورا قبیلہ یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتا تھا۔ جب زرعی انقلاب آیا تو رفتہ رفتہ شخصی املاک کا آغاز ہوا، جس نے وحدت انسانیت کو پارہ پارہ کیا۔ آقا، غلام، زمیندار اور مضارع جیسے طبقات معاشرے میں بن گئے۔ حصول املاک کے لالچ نے ظلم وجبر واستبداد، لوٹ کھسوٹ، قتل وغارت، تصرف وتقلیب، لالچ اور حسد جیسے منفی جزیات کو ابھارا کمزوروں اور محنت کشوں کیلئے یہ دنیا دوزخ بن گئی۔ مذہب کو پادریوں نے عوام کے استحصال کیلئے استعمال کیا۔ اور جب لوگ پادریوں پر سوالات اٹھاتے یا مزاحمت کرتے تو یہ جبر کے ذریعے ان کی زبان بند کراتے یا پھر عالم آخر سے ڈراتے رہتے اور ان کو ایک خیالی دنیا اور مثالی معاشرہ جس کو یونانی زبان میں ''یوٹوپیا'' کہتے ہیں۔ کے لئے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کرتے۔ افلاطون سمیت کئی خردمندوں نے اپنے ''یوٹوپیا'' یعنی اشتمالی معاشرے کے حق میں قلم اٹھایا اور شخصی املاک کو تمام مصائب و جرائم کی جڑ قرار دیا ہے۔

افلاطون کی کتاب جمہوریہ میں اس طرح کے مثالی ریاست پر مکالمے ملتے ہیں جسمیں شخصی املاک کا کوئی تصور نہیں سب لوگ اجتماعی بہبود اور ریاست کیلئے کام کرتے ہیں۔ زندگی کی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا، مکان، روزگار اور تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ افلاطون نے تین طبقے بنائے ہیں۔ ایک طبقہ حکام کا جو ریاست کے امور چلاتے ہیں افلاطون کے بقول حکام کو فلسفی اور خردمند ہونا چاہیے تا کہ ریاست کیلئے قوانین وضع کر سکیں۔ اور ان قوانین کو نافذ کرنے کیلئے سخت جان فوجی ہونگے تا کہ قوانین کا نفاذ ممکن ہو سکے اور تیسرا طبقہ عوام کا جو محنت کریں گے۔

شاہ قباد کے دور میں ایران کے ایک شہری نے اشتمالیت کی تبلیغ شروع کی ان کا نعرہ تھا کہ ''زر، زن اور زمین'' اصل فساد کا باعث ہے۔ اس وجہ سے ان کو سب انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تو خوشحالی آئی گی۔ بادشاہ وقت اس کے اس نعرے سے متاثر ہوئے اور جاگیرداروں سے زمینیں لینی شروع کیں۔ لیکن جاگیرداروں نے اتحاد کر کے اس کو معزول کیا اور بادشاہ کے بھائی کو تخت پر بٹھایا لیکن کچھ عرصے بعد جب شاہ قباد کسی طرح دوبارہ تخت پر قابض ہو گیا تو درباریوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ ملک میں تمام فساد اور مسائل کی جڑ مزدک اور اس کے پیروکار

ہیں۔اس وجہ سے بادشاہ نے مزدک اوران کے پیرکاروں کودربار میں بلایااور سپاہیوں کے مدد سے قتل کیااور بعد میں پورے ملک میں ایک ایک مزدکی کوڈھونڈکرقتل کیا۔

نشاۃ ثانیہ کے دور میں ایک انگریز عالم ٹامس مورتھا جس نے ہشتم ہندوی کوکلسیا کا صدر ماننے سے انکار کیا جس کے پاداش میں اس کوقتل کیا گیا۔ٹامس مور نے بھی شخصی املاک کوتمام مسائل کا جڑ بتایا ہے۔اوراپنی ایک مثالی ریاست کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ٹامس مور کی یوٹپا کے اشاعت کے بعد اطالیہ کے ایک عالم کمپانیلا کی ایک کتاب صحرائے آفتاب شائع ہوئی۔اس نے ذاتی املاک کوتمام مسائل کی جڑ بتایا۔مرداورعورت کے مساوی ہونے کا نعرہ بلندکیا۔

اٹھارویں صدی یورپ میں خردافروزی کی صدی ہےاس صدی میں یورپ میں تعقل پسندی کوفروغ حاصل ہوا۔اس کا آغاز بیل (1644-1706) سے ہوا۔ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اس نے تاریخ جغرافیہ، ادبیات، لسانیات اورالہیات پرمنفردمقالے لکھے۔وہ ہرمسئلہ کوعقلیت کے نقطہ نظر سے دیکھتا تھا۔فرانس کے بہت دانشواران سے متاثر ہوئے جن میں ویدرو، والٹیر، دولباخ؛ شامل تھے۔انھوں نے بھی بادشاہ اوراس کے درباریوں کے عیاشیوں پرتنقید کی۔

دولباخ نے اپنی کتابChirstinonity Exposedعیسائیت کا کچھا چٹھا میں کلسیا اوررياست کے گٹھ جوڑ پرتنقید کی ہے۔

گراکس باہو (1760-1767) اوراس کے ساتھیوں نے انقلابی جمہوریہ کے نام پرتحریک چلائی اور ایک منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دی۔انہوں نے حکومت پر قبضے کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے گلوٹین پر موت کی سزادی گئی۔

انیسویں صدی کے یوٹوپیائی اشتمالیت پسندوں نے بھی 18ویں صدی کی تحریک خردافروزی سے فائدہ حاصل کیا۔

مشارل فورتیے (1792-1837) نے بورژوا معاشرے پر عالمانہ نقدلکھا۔ان کا خیال تھا کہ مادیت ہی انسان کی تشکیل کرتی ہے۔

نکولائی چرنی میونسکی (1828-1889) روس کا مادیت پسند انقلابی عالم تھا۔ جسے انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں سائبریا بھیج دیا گیا۔ اس نے خواص خمسہ سے حاصل کردہ علم کو مستند قرار دیا۔ کانٹ پر تنقید کی۔ مارکس نے چرنی شومنکی کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ آخر میں پرودوں کی کتاب املاک کیا ہے قابل ذکر ہے اس میں پرودوں کہتا ہے ''تمام املاک چوری'' قابل ذکر ہے۔ اس کتاب سے جو پڑھے لکھے انقلابی متاثر ہوئے ان میں کارل مارکس بھی تھا۔ لیکن بعد میں اختلاف رائے کی وجہ سے ان سے الگ ہو گیا۔

افلاطون سے لیکر پرودوں تک یوٹوپیا کے مصنفین نے اشتمالیت کی روایت کا تحفظ کیا ہے۔ بلکہ اس کا پرچار کیا۔ کارل مارکس اور اینجلز نے ان خیالات کو حقیقت کا روپ دینے کیلئے انقلابی جدوجہد کا آغاز کیا۔ کارل مارکس انیسویں صدی کا انقلابی مفکر تھا جو جاگیرداری نظام کا سخت مخالف تھا۔ جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے کسان اپنے حقوق سے محروم تھے۔ اپنے انقلابی افکار کی تبلیغ کیلئے مارکس نے ایک جریدے نیشن زائی شنگ پر مقالات لکھے۔ جس سے اُس کی علمیت کی ہر جگہ دھاک بیٹھ گئی۔ 1843ء میں حکومت نے پرچہ بند کر دیا۔ انہی دنوں مارکس نے اپنا چھاپہ خانہ قائم کیا اور ایک نیا پرچہ ''نیوز نیشن'' کے نام سے جاری کیا۔ لیکن اس رسالے کو بھی بند کر دیا گیا۔ حکومت کی طرف سے سختیوں کی وجہ سے مارکس کو ہجرت کرنی پڑی۔ اس مصیبت کے دور میں اس کو جرمنی پیرس اور بلجیم سے بار بار جلا وطن کیا گیا۔ ان سخت حالات میں اس کی وفادار بیوی نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ برسلز میں تو پولیس نے کارل مارکس کو گرفتار بھی کیا۔ بعد میں کارل مارکس کی اینجلز سے پہلی ملاقات پیرس میں ہوئی۔ یہ دونوں چونکہ نظریاتی طور پر ہم آہنگ تھے اس وجہ سے ان میں دوستی ہو گئی۔ اس کے بعد دونوں دوست مل کر جدوجہد اور انقلاب کیلئے راستے ہموار کرتے رہے۔

فریڈرک اینجلز 28 نومبر 1830ء کو جرمنی کے ایک شہر بارمن میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک خوشحال صفت تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اینجلز بھی مارکس کی طرح شعر کہا کرتا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد والد کے ساتھ کاروبار میں شریک رہا لیکن جلد ہی اس کا مزاج اکتا گیا اور انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انقلابیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ لیکن ان کو شکست ہوئی شکست کے بعد وہ بچ کر نکل گیا اور برطانیہ چلا گیا۔ مانچسٹر میں اپنے باپ کے کارخانے میں کام کرنے لگا اس دوران اس نے کارخانوں، فیکٹریوں میں مزدوروں کی حالت زار بھی دیکھی اور اپنی کتاب انگلستان کے مزدور طبقے کا احوال میں اس کی تفصیل لکھی۔ جس سے پہلی

بارلوگ مزدور طبقے کے مسائل وتکالیف سے آگاہ ہوئے۔ اینجلز بھی مارکس کی طرح مادیت پسند اور پرجوش انقلابی تھے۔ نہایت کھلے دل سے تاریخی مادیت کے نظریئے کی اولیت اور معاشرہ میں انسانی جدلیاتی ارتقاء کے تصور کو کارل مارکس سے منسوب کرتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی فکری وعلمی قابلیت بھی گراں قدر تھی۔ ریاست کی ابتداء کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاست اس وقت عالم وجود میں آئی ہے جب معاشرہ مختلف طبقات میں بٹ گیا۔ غالب طبقے نے محکوم طبقے پر اپنا تسلط قائم کیا اور اس کو ریاست کا نام دیا گیا۔ اینجلز کا کہنا ہے کہ محض زبانی نعروں سے مزدوروں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے لئے مسلح جدوجہد کی ضرورت ہے۔ جب پورے یورپ میں کارل مارکس کو کہیں پناہ نہ ملی تو وہ لندن چلا گیا۔ 1848ء میں کارل مارکس نے اپنا مشہور معروف انقلابی منشور شائع کیا۔ جس میں دنیا بھر کے مزدوروں کو اتحاد اور انقلابی جدوجہد کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے نعرہ لگایا۔ ''دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ'' لندن میں کارل مارکس کو بے پناہ مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل جینی نام خطوط سے ملتی ہے۔ یہ داستان اندوہناک بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی۔ معاشی کمزوری کی وجہ سے مارکس نے امریکی جریدے کیلئے لکھنا شروع کیا۔ جس کا معاوضہ اسے فی مقالہ ایک پونڈ ملتا تھا۔ سردی میں خوراک کوئلے کی فراہمی میں مشکل پیش آتی تھی۔ کئی دفعہ مارکس کو اپنے کپڑے گروی رکھنے پڑے وہ اپنے بیٹیوں کو سکول میں داخلہ نہیں دلا سکا وہ گھر میں مقید ہو کر رہ گئیں تھیں۔ کیونکہ ان کے جوتے گروی رکھ دے جاتے تھے۔ مصیبت اور آزمائش کے اس زمانے میں اینجلز نے کارل مارکس کی فراخ دلی سے مالی امداد کر کے دوستی کا حق ادا کیا اور ہر لمحے بھرپور سہارا دیا۔

کارل مارکس نے مصیبت کی اس گھڑی میں اپنا فکری وعملی کام پورے عزم وحوصلے کے ساتھ جاری رکھا۔ اس نے آدم سمتھ، ریکارڈ اور مالتھس کی کتابوں کا خصوصی مطالعہ کیا۔ اور برٹش میوزیم میں کئی برس کے مسلسل مطالعے کے بعد اور انگلستان کے کارخانوں میں مشقت کرنے والے مزدوروں کے حالات ومشاہدات کے اپنی عہد آفرین کتاب ''داس کیپیٹل'' تصنیف کی۔ یہ کتاب 1876ء میں شائع ہوئی۔ مارکس نے اس کتاب میں مادی جدلیات کا سائنسی تصور پیش کیا کہ پیداواری رشتوں میں کس طرح مادی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اس کو بجا طور پر محنت کشوں کی ''انجیل'' کہا جاتا ہے۔ کارل مارکس نے پہلی مرتبہ سائنسی بنیادوں پر یہ ثابت کیا ہے کہ محنت ایک جنس ہے جسے کارخانہ دار دوسرے اجناس کی طرح سستے قیمت پر خریدتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع کما سکے۔ محنت کش مزدور جو کام کرتا ہے اور جو اجرت اسے ملتی ہے اس کا فرق زاید قدر ہے جو سرمایہ دار کا منافع بنتا ہے۔ داس کیپٹل کا پہلا ترجمہ روسی زبان میں ہوا اگرچہ روسی زبان میں ترقی پسند خیالات پر سخت پابندی تھی لیکن داس کیپٹل ایک مشکل

اور دقیق کتاب تھی اس وجہ سے محکمے والے یہ سمجھتے کہ اس کتاب سے کچھ نہیں ہوگا۔ داس کیپیٹل کی اشاعت سے بورژوا دانشوار طبقہ مرضِ حسد میں مبتلا ہوا وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کتاب پر ادبی حلقوں یا علمی حلقوں میں بحث و مباحثہ ہو یا کارل مارکس کو اس سے شہرت ملے۔ انہوں نے کارل مارکس کے ذات پر کیچڑ اچھالنا شروع کیا لیکن تاریخ نے کارل مارکس کی عظمت کو ثابت کیا اور حتی کہ اپنی زندگی میں بھی مارکس اپنے دور کا عظیم اشتراکی مفکر کہلایا گیا۔ مارکس نے اپنی زندگی میں پیش گوئی کی تھی کہ روسی سرزمین انقلاب کیلئے سازگار ہے کیونکہ وہاں غربت وافلاس زیادہ تھی زارشاہی حکومت کسانوں سے بھاری ٹیکس لیتے تھے اس وجہ سے روسی معاشرے میں ''بوژوا'' طبقے کے خلاف ایک نفرت پائی جاتی تھی۔ اور ان کے خلاف مختلف تحریکیں چل رہی تھیں۔ چرنی ستفنکی جو ایک روسی ترقی پسند تھا۔ اس نے بوروژا طبقے کے خلاف روس میں بہت کام کیا۔ مارکس نے اس کی تعریف کی ہے۔ اُس نے اس بات پر زور دیا کہ انقلاب حرکت سے آئے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ خود بخود سرمایہ دارانہ سماج اشتراکی سماج میں تبدیل ہو جائے۔ مارکس نے طاقت کا سرچشمہ عوام کو ہی قرار دیا اور اس نے کہا عوام ہی کے ذریعے ہمہ گیر انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔

مارکس نے 1864ء میں پہلی بار بین الاقوامی مجلس لندن میں بلائی۔ دنیا بھر کے انقلابی مارکس سے ہدایات لینے ان کے گھر آتے تھے مسلسل غربت افلاس، معاشی تنگی اور بیوی کی وفات نے مارکس کو ذہنی وجسمانی طور پر متاثر کیا۔ وہ بیوی کے غم سے نہیں سنبھلا تھا کہ اس کی بڑی بیٹی ''جینی'' بھی مرگئی۔ جو اس کو بڑی پیاری تھی۔ یہ صدمہ مارکس کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ بیماری کی وجہ سے اکثر صاحب فراش رہنے لگا۔ اس دوران بھی وہ دنیا کے مختلف زبانوں میں مطالعہ کرتا تھا۔ اسی بیماری کی حالت میں ایک دن جب وہ مطالعہ کی کرسی پر آرام کر رہا تھا ان کا دوست اینجلز ملاقات کے لئے آیا تو اس نے دیکھا مارکس ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ اینجلز نے اس کی کفن ودفن کا بندوبست کیا اور ان کے قبر پر ان کے خدمات کے حوالے سے خطبہ بھی دیا۔

اینجلز نے مارکس کے کام کو آگے بڑھایا۔ ان کی کتاب داس کیپٹل کو چھپوایا۔ اور آخر کار پچھتر سال کی عمر میں یہ انقلابی رہنما بھی دنیا سے کوچ کر گئے۔ مارکس اور اینجلز دونوں ایسے انسان تھے جنہوں نے ساری زندگی محنت کشوں کیلئے وقف کی تھی۔ ان کے تعلیمات پر سب سے پہلا انقلاب 17 اکتوبر 1917ء کو روس میں آیا۔ انقلاب روس نے زارشاہی کے بعد روس کو غربت افلاس سے نکالا۔ اور نہایت کم عرصے میں تمام سامراجی ملکوں کی مخالفت کے باوجود کسی طرح معاشی اہداف حاصل کئے۔ ساری دنیا حیران پریشان تھی۔ حالانکہ روس کی 1945ء میں ہٹلر

کے خلاف بھی لڑنا پڑا جس میں کروڑوں لوگوں کو مارا گیا۔اور بالآخر جرمن فوجوں کو شکست ہوئی۔

یہ اشتمالی روایت کا سرسری جائزہ تھا اب ہم اس روایت کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں یعنی ابتدائی کمیونزم جب لوگ قبیلوں کی صورت میں رہتے تھے سب کماتے اور مل جل کر کھاتے تھے۔ پھر یہ سماج غلام دارانہ سماج میں یہ کیسے تبدیل ہوا؟ اور غلام دارانہ سماج جاگیردارانہ سماج میں کس طرح بدل گیا؟ صنعتی انقلاب کیوں کر؟ اور کیسے آیا؟ صنعتی انقلاب کے بعد کمیونسٹ انقلاب کے لیے کیسے راستہ ہموار ہوا۔ یہ تاریخ کا ایک سائنسی سفر ہے جس کو کارل مارکس نے جدلیاتی مادیت کہا ہے۔

تاریخی مادیت جنگل اور غاروں میں زندگی گزارنے سے لیکر موجودہ کمپیوٹر کے عہد تک انسان نے تاریخ کا ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ غاروں کا دور اشتراکی دور تھا۔ جس میں سب لوگ مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے۔ فریڈرک اینگلز، خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز میں لکھتے ہیں:

> آبادی بہت کم اور بکھری ہوئی تھی۔ وہ صرف قبیلوں کے رہنے کی جگہ میں گنجان ہوتی تھی۔ جس کے چاروں اطراف شکارگاہ ہوتی تھی اور اس کے آگے غیر مقبوضہ جنگل جو اسے دوسروں قبیلوں سے دور رکھتا تھا۔ محنت کی تقسیم محض ایک فطری چیز تھی۔ یہ تقسیم صرف مردوں اور عورتوں کے درمیان تھی۔ مرد لڑائی پر جاتے تھے، شکار کرتے تھے، مچھلی پکڑتے تھے، غذا کے لیے کچا مال لاتے تھے اور ان کاموں کے لیے ضروری اوزار بناتے تھے۔ عورتیں گھر سنبھالتی تھیں، کھانا پکاتی تھیں اور کپڑے بنتیں اور سیتیں تھی۔ مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے کام کے شعبے میں آپ اپنے مالک تھے۔ جنگل میں مرد اور گھر میں عورت کا بول بالا تھا۔ مرد ہتھیاروں اور شکار کرنے والے اوزاروں کے مالک تھے اور عورت گھر کے ساز و سامان اور برتنوں کی۔ گھرانا کمیونٹی تھا۔ جس میں کئی اور اکثر بہت سے خاندان ہوا کرتے تھے۔ جو کچھ مشترک طور پر کہا جاتا تھا اور جسے مل کر استعمال کرتے تھے وہ سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی۔(۱)

یہ وہ دور تھا جس میں نجی جائیداد کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ خوشحال دور تھا۔ اس دور کے متعلق سید سبط حسن موسیٰ سے مارکس تک میں لکھتے ہیں:

لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں مل جل کر پیدا کرتے تھے اور آپس میں بانٹ لیا کرتے تھے۔ معاشرے کے اس دور کو عمرانیات کی اصطلاح میں ''ابتدائی کمیونزم'' کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ دور لاکھوں برس تک جاری رہا ابتدائی کمیونزم کا زندہ مگر شاید سب سے پرانا نمونہ قبیلہ تا سادے Tasaday کے لوگ ہیں۔ سو 100 افراد کا یہ گروہ جو حال ہی میں (1941) اتفاقاً دریافت ہوا۔ ریاست فلپائن کے جزیرہ مندانو کے پہاڑوں میں رہتا ہے۔ یہ پہاڑ گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اور وہاں تک پہنچنا بہت دشوار ہے۔ اب سے پندرہ برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز دفالونامی ایک چڑی مار کا گزر اس جنگل میں ہوا تو اس زمین پر جا بجا انسانوں کے قدموں کے نشان نظر آئے وہ ان نشانوں کے پیچھے ہولیا اور ابھی تھوڑی دور چلا تھا کہ اس کو تین ننگ دھڑنگ آدمی دکھائی دیئے جنھوں نے اپنا آگا پیچھا پتے کی رسیوں سے ڈھک رکھا تھا۔ چڑی مار کو دیکھ کر وہ بھاگ کھڑے ہوئے لیکن اس نے جب دوستانہ لہجے میں آواز دی تو رک گئے اس طرح دنیا کو پہلی بار زمین کے سب سے قدیم باشندوں کا سراغ ملا۔ تا سادے ابھی پتھر کے زمانے میں رہتے ہیں جو پندرہ ہزار برس گزرے ختم ہو گیا۔ ان کی پناہ گاہ پچاس فٹ چوڑا اور تیس فٹ گہرا ایک غار ہے ناریل کا پھل اور بانس کی کونپلیں ان کی خوراک ہے۔ وہ لکڑی کے ٹکڑوں کو رگڑ کر آگ پیدا کرتے ہیں اور پتھر کے ہتھوڑوں اور بانس کی چھوٹی چھوٹی چھریوں کے سوا ان کے پاس کوئی اوزار نہیں وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں، مینڈک اور کیکڑے ہاتھ سے پکڑتے ہیں اور بھون کر کھا لیتے ہیں۔ وہ کھیتی باڑی کرنا بالکل نہیں جانتے اور نہ مویشی پالتے ہیں۔ انھوں نے نمک، چاول، مکئی یا شکر کبھی نہیں چکھا ہے۔ وہ تمباکو کے استعمال سے بھی واقف نہیں۔ وہ جزیرے میں رہتے ہیں مگر انہوں نے سمندر کبھی نہیں دیکھا۔ (۲)

آج کے زمانے میں یہ کوئی نئی بات نہیں افریقہ کے بہت سارے قبیلے آج بھی اشترا کی زندگی گزارتے ہیں جس پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ پتھر کے زمانے میں جب انسان نے فصلوں کو اگانے کا طریقہ سیکھ لیا۔ بارش، قحط سالی اور دیگر قدرتی آفات کے سبب بعض اوقات خوراک ختم ہو جاتی جس کے باعث لوگوں کو بھوکوں مرنا پڑتا تھا۔ پھر کسی ایک قبیلے نے ان ناگہانی آفات کے دور کے لیے خوراک ذخیرہ کرنا شروع کر دی۔ ایسا وقت آیا کہ ان کی ذخیرہ شدہ

خوراک قحط سالی کے موسم میں کوئی دوسرا قبیلہ لوٹ کر لے گیا تو انہیں اس ذخیرے کو محفوظ کرنے اور اس کی حفاظت پر کچھ لوگوں کو معمور کرنے کا خیال آیا۔ قبیلے کے تنومند اور طاقت ور نوجوانوں کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ اس حوالے سے علی عباس جلال پوری اپنی کتاب تاریخ کا نیا موڑ میں لکھتے ہیں۔

> بستوں کے مکینوں نے اس کی ترکتاز کا مقابلہ کرنے کے لیے ہتھیار بند دستے بنائے، جن کی قیادت تنومند اور دلاور افراد کے پاس رکھی گئی۔ یہ سردار جنگی تیاریوں میں مصروف رہتے تھے۔ اس لیے تمام کاشتکاروں نے اپنی پیداوار کا کچھ حصہ ان کی وجہ معاش کے لیے وقف کر دیا تا کہ وہ یکسوئی سے دفاع کا کام سرانجام دے سکیں۔ یہی رسم بعد میں مالیہ اور خراج کی صورت اختیار کر گئی جو آج بھی زرعی ممالک میں وصول کیا جاتا ہے۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ یہ سردار بادشاہ بن بیٹھے اور عوام کے ذہن و دماغ پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے دیوتاؤں کی اولاد ہونے کا دعوی کرنے لگے۔ (۳)

یہی زرعی سماج کی ابتدا ہے۔ زرعی انقلاب کے اثرات انسانی معاشرے پر بڑے گہرے اور دوررس ہوئے۔

دریاؤں کے کنارے بستیاں بسانے کے ساتھ گوناگوں مسائل پیدا ہوئے، سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح ان بستیوں کو ان صحرائیوں اور کوہستانیوں سے بچایا جائے، جو بدستور خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب کبھی انہیں موقع ملتا وہ بستیوں پر ٹوٹ پڑتے اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیتے۔ بستیوں کے مکینوں نے اس کی بربریت کا مقابلہ کرنے کیلئے ہتھیار بند دستے بنائے جن کی قیادت طاقت ور اور بہادر افراد کے سپرد کی گئی۔ یہ سردار جنگی تیاریوں میں مصروف رہتے تھے۔ اس لئے عام کاشتکاروں نے اپنی پیداوار کا کچھ حصہ ان کی وجہ معاش کیلئے وقف کر دیا تا کہ وہ یکسوئی سے دفاع کا کام سرانجام دے سکیں۔ یہی رسم بعد میں مالیہ اور خراج کی صورت اختیار کر گئی، جو آج بھی زرعی ممالک میں وصول کیا جاتا ہے۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ یہ سردار بادشاہ بن بیٹھے اور عوام کے ذہن و دماغ پر اپنا تسلط قائم کرنے کیلئے دیوتاؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔

شہری ریاستوں اور انتظامی ضرورتوں کی وجہ سے معاشرہ طبقات میں تقسیم ہو گیا سب سے اونچا طبقہ بادشاہ اور اس کے درباریوں کا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں فوجی طاقت تھی جو زمین پر قابض تھے۔

دوسرا طبقہ تاجروں اور چھوٹے مالکان کا تھا جو غلہ فراہم کرتے تھے اور سب سے نچلا طبقہ غلاموں کا تھا اس حوالے سے سید سجاد ظہیر اپنی کتاب مارکسی فلسفہ میں لکھتے ہیں۔

> غلامی کے نظام میں پیداواری تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں غلاموں کا مالک یا آقا ذرائع پیداوار کا بھی مالک ہوتا ہے۔ وہ اس محنت کش انسان کا مالک ہوتا ہے جس کی محنت سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اس غلام سے کام لے سکتا ہے۔ اسے بیچ یا خرید سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے ایک جانور کی طرح قتل کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ (۴)

غلاموں کو پہلے مار دیا جاتا تھا لیکن بعد میں جب کسی دوسرے قبیلے کے لوگ جنگ میں پکڑے جاتے تو ان سے سخت کام لئے جاتے ان کو عمر بھر کے لیے غلام بنایا جاتا تھا۔ ان کو سر عام بھیڑ بکریوں کی طرح نیلام کیا جاتا۔ غلام اور لونڈیوں کا تحفتاً تبادلہ ہوتا۔ افریقہ، ایشیاء اور یورپ کے پسماندہ علاقوں پر دھاوے بول کر ہزاروں عورتوں، مردوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لے جاتے اور پھر انہیں غلام بناتے ان کو کھانا اتنی مقدار میں دیا جاتا کہ اس سے غلام طاقت ور رہیں تا کہ اُن کے کام کرتے رہیں۔ سلاطین اور امراء کے محلوں میں سینکڑوں لونڈیاں رکھی جاتیں۔ تاریخ میں ایسا کئی بار ہوا ہے کہ غلاموں نے بغاوت کی۔ روم میں سپارٹا ''کسس'' نامے غلام نے غلاموں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور کئی برس تک سرکاری فوجیوں کو مسلسل شکست دیتا رہا۔ آخر کار حکومت نے دھوکے اور فریب سے بغاوت کرنے والوں پر قابو پالیا اور پھر ہزاروں غلاموں کو سڑک کے کنارے سولیوں پر لٹکا کر مارا۔

عباسی دور میں غلاموں کو زمین میں زندہ دفنا دیا جاتا تھا۔ اس دور میں غلاموں سے زمینوں میں کام لیکر اراضی قابل کاشت بنائی جاتی تھی آخر میں زیادہ محنت اور مشقت سے غلاموں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔ اور انہوں نے علی بن محمد کی راہنمائی میں بغاوت کی بغاوت پر قابو پانے کیلئے ایک زبردست فوج بغداد سے بھیجی گئی لیکن غلاموں نے جان پر کھیل کر فوج کو شکست فاش کیا۔ دوسری بار بغداد سے موسیٰ بن بغا کے ایک عظیم الشان لشکر کی بغاوت کو قلع قمع کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ لیکن غلاموں نے ان کو بھی عبرتناک شکست دی۔ علی بن محمد نے حکومت قائم کی ساری زمینوں کو غلاموں میں برابر تقسیم کیا۔ اور چودہ سال تک مسلسل وہ حکومتی فوجوں کے ساتھ لڑتے رہے۔ بالآخر علی بن محمد کو ایک جنگ میں مارا گیا اور بعد میں بغاوت کو کچل دیا گیا طبری اور مسعودی نے ان حالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

جاگیرداراورمزارع:

اب چونکہ غلام کھیتوں میں بے دلی سے کام کرتے رہے اس وجہ سے جاگیردار نے یہ سوچ کر اپنی زمین مضارع کو کاشتکاری کیلئے دے دی جائے اور پیداوار میں اس کیلئے ایک معمولی حصہ مقرر کیا جائے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مضارع دل و جان سے پیداوار کو بڑھانے کیلئے سخت محنت کرے گا اگر وہ سخت محنت کرے گا تو غلہ زیادہ ہوگا جس میں اس کا حصہ قدرے زیادہ ہوگا۔ سجاد ظہیر، مارکسی فلسفہ میں لکھتے ہیں:

> جاگیری نظام میں پیداواری تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ جاگیردار، راجہ، نواب، ذرائع پیداوار کا تو مالک ہوتا ہے لیکن مزارع یا کاشتکار پر اس کی ملکیت پوری نہیں ہوتی۔ وہ ایک غلام کی طرح اسے مار نہیں سکتا۔ لیکن اسے خریدنے اور بیچنے کا حق رکھتا ہے۔ اور جہاں جاگیردار کے جاگیرانہ حقوق ہوتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ کاشتکار اپنے آلات پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ اس قسم کی پیداواری تعلقات فی الجملہ اس دور کی پیداواری طاقتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس دور میں لوہے کے اوزار اور اچھی طرح بننے لگے تھے۔ زراعت، باغبانی اور دستکاری کے ساتھ ساتھ صنعت بھی وجود میں آ گئی تھی۔ (۵)

اس کے بعد بھی صدیوں تک غلامی جاری و ساری رہی۔ لیکن اب غلاموں سے کھیتوں میں کام لینے کے بجائے گھروں میں کام لیا جاتا۔ اب یہ کشمکش جاگیردار اور مضارع کے مابین تھی اگر چہ مزارع برائے نام آزاد تھا لیکن ان کی حالت تو غلام سے بھی بدتر تھی کیونکہ غلام کے نان نفقے کا انتظام ہر صورت آقا کے ذمے ہوتا تھا۔ اب مضارع سال کے بارہ مہینے کام کے باوجود گھر میں فاقے ہوتے تھے۔ اور جب جاگیردار سے قرض لیتا اور قرض واپس نہ کر سکتا تو جاگیردار ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کی عزت کو پامال کرتے ہوئے اپنا غلام بنا کر ان سے کام لیتا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ اب آقا اور غلام کے بجائے یہ کشمکش جاگیردار اور مزارعوں کے مابین شروع ہوئی۔ کسانوں اور مزارعوں نے جا بجا بغاوتیں کر کے انقلابی تحریکوں کا آغاز کیا اس طرح کی ایک بغاوت اٹھارہ عیسوی میں چین کے صوبہ شان ٹنگ میں ہوئی۔ ہزاروں غضب ناک کسانوں نے شہر میں گھس کر سرکاری اہل کاروں اور جاگیرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسری بغاوت چین کے کسانوں نے چوراسی 1984ء عیسوی میں کی اور یہ شورش چوبیس برس تک جاری رہی اس کی وجہ سے چین تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ چین کے انقلابی رہنما ماوزتنگ کسانوں کے بغاوت

کے روایت سے بے حد متاثر تھا۔ اسی طرح انگلستان میں ایک غریب کسان نے کسان تحریک کا آغاز کیا۔ حکومت نے اس تحریک کو کچل دیا۔ 1524ء میں جرمنی کے کسانوں نے بغاوت کی سرکاری محصولات اور کلسیا کے عشر ادا کرنے سے انکار کیا۔ اس بغاوت میں ہزاروں کسان روند دیئے گئے۔ ماٹن لوتھر جو ایک عیسائی مصلح اور مذہبی رہنما تھا۔ اس نے اس سخت وقت میں حکومت کا ساتھ دیا اور کسانوں پر کفر و زندیق کے فتوے لگائے۔ اسی طرح دنیا بھر میں وقت بہ وقت اس طرح کی بغاوتیں ہوتی رہی۔ جسکو حکومت وقت سختی سے کچلتی رہی۔ 1870ء میں فرانس کے دارالحکومت پیرس پر مزدوروں نے قبضہ کیا اور 70 دن تک حکومت کی۔ لیکن ان کو چاروں طرف سے گھیر کر خون میں نہلا دیا۔

صنعتی انقلاب

مشین ایجاد ہونے کے بعد پیداواری قوتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ وہ کام جو ایک انسان کئی دنوں میں کر سکتا تھا اب مشین اس کام کو بہت کم وقت میں بہتر طریقے سے سرانجام دے سکتی تھے۔ سجاد ظہیر، مارکسی فلسفہ میں لکھتے ہیں:

> سرمایہ دار منافع خوری کی غرض سے پیداوار کو فروغ دیتے ہیں تو وہ بڑے بڑے کارخانے فیکٹریاں قائم کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں، لاکھوں مزدور بھی بڑے بڑے مرکزوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ داری پیداوار کے عمل میں ایک اجتماعی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اس طرح خود اپنی بنیادوں کو کھوکھلا کرتی ہے۔ (۶)

اس طرح مشین کی وجہ سے صنعتی انقلاب کیلئے راہ ہموار ہوئی جس نے معاشرے پر گہرے اثرات چھوڑ دیئے۔ لیکن یہ سب کچھ سائنس کے مرہون منت تھا۔ سائنس نے ہی صنعتی انقلاب کو ممکن بنایا۔ روم کے زوال کے بعد تقریباً ہزار سال تک مغرب پر جہالت کی تاریکیاں چھائی رہیں۔ اس دوران عالم اسلام اور چین میں اچھی خاصی ترقی تھی۔ ہسپانیہ پر مسلمانوں کی حکومت تھی جو علم و ادب کے قدردان تھے۔ مسلمانوں کے علم کی کرنیں شام اور ہسپانیہ کے ذریعے مغرب کو پہنچیں۔ ابن رشد کو مغرب میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کیونکہ وہ مذہب اور فلسفہ دونوں کو سچا جانتا تھا۔ لیکن اہل مذہب کو فلسفہ میں رائے زنی سے منع کیا۔ اس وجہ سے مغرب میں فلسفے اور مذہب کو جدا کیا گیا۔ جس سے فکر کی آزادی کو تقویت ملی۔ اس وجہ سے اہل کلسیا نے جو ذہنوں میں سائے بٹھائے تھے وہ اب

چھٹ گئے۔ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب اردو ادب کی تحریکیں میں لکھتے ہیں:

> کائنات کے اس نئے تصور نے انسان بے بلند و برتر ہونے کا اعزاز چھین لیا اور اس کے ساتھ نظریات کی کایا پلٹ دی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں زراعت کے سست رفتار عمل کے مقابلے میں تجارت کے عمل تیز و رفتار کو فروغ حاصل ہوا۔ اور متوسط طبقے پر مشتمل ایک ایسا معاشرہ وجود میں آنے لگا۔ جس کے ساتھ اعتقادات کو متذکرہ بالا اسباب نے متزلزل کر دیا تھا۔ زندگی کے ہر تبع میں کسی نہ کسی طرح تحریک کا بیج پھلتا پھولتا دکھائی دیتا ہے۔ مختلف علوم کی یہ تحریکیں چوں کہ ہر وقت رونما ہوئیں اور ان کی بدولت معاشرہ کلیتًا منقلب ہوا اس کے ان کے اجتماعی عمل کو نشاۃ الثانیہ۔۔۔۔کا نام دیا گیا۔(۷)

رفتہ رفتہ مغرب میں جامد خیالات کے خلاف بغاوت ہوئی یہ وہ دور تھا جب مشرق میں مذہبی جنون اور فلسفے پر لعن طعن ہو رہی تھی۔ ابن رشید کے خیالات مسترد ہو چکے تھے اہل مغرب علم و فنون میں ترقی کر رہا تھا۔ گلیلیو، کوپرنیکس، نیوٹن اور کاپلز نے سائنس کی دنیا میں حیرت انگیز انکشافات کیئے۔ کولمبس اور واسکوڈے گاما نے بحری سفر کے ذریعے نئے راستے معلوم کیئے سائنس کی یہ ترقی کا سفر جاری تھا کہ برطانیہ میں صنعتی انقلاب آیا۔ رانا یوسف خان اپنی کتاب اشتراکیت کی چند نظریاتی پہلو میں لکھتے ہیں:

> جاگیرداری سماج ڈھانچہ ٹوٹنے کے بعد سرمایہ داری دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جاگیرداری سماجی ڈھانچے کے اندر ہی سرمایہ داری ڈھانچہ پلتا رہا۔ اور بلا آخر جاگیرداری سماجی ڈھانچے کے بطن سے جنم لے کر اس کی جگہ لی اور ایک بہت بڑے انقلابی دور کا آغاز کیا سب سے پہلے اس نئے سماج نے پرانے سماجی شہری قانونی بندھنوں کو توڑا۔(۸)

1730ء میں آوک رائٹ نام شخص نے سوت کاتنے کی مشین ایجاد کی۔ جو آبی قوت سے چلتی تھی۔ چمنر واٹ نے 1782ء میں ذخانی انجن ایجاد کیا۔ 1829ء میں دو شہروں لورپول اور مانچسٹر کے درمیان ریل کی پٹری بچھا دی گئی۔ 1842ء میں سموئیل مورس نے برقی تار ایجاد کی۔ 1800ء سے 1850ء کے مابین صنعتی انقلاب کے اثرات برطانیہ سے نکل کر جاپان تک پہنچ گئے۔ انگلستان میں سوتی کپڑا بننے اور فولاد ڈھانے کے بڑے بڑے کارخانے قائم کر دیئے گئے۔ اب جبکہ مغرب میں صنعتی انقلاب آچکا تھا۔ اس وجہ سے اب ان کو خام مال کی

ضرورت تھی جس کو مشین سے گزار کر ایسی مصنوعات کے صورت میں دی جا سکے۔ لیو پیو برمین اپنی کتاب یورپ امیر کیسے بنا میں لکھتے ہے۔

> سولہویں صدی میں جب پروٹسٹنٹ فرقے نے اصلاح وتجدید کی تحریک شروع کی تھی یہ وہ دور تھا جب سرمایہ اکٹھا کرنے کی ضرورتوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور اس کے لیے سود پر پابندیاں خارج ہو رہی تھیں۔ اس وقت پروٹسٹنٹ کلسیا نے ان ضرورتوں کی تکمیل کی طرف قدیم اٹھایا تھا۔ اسی طرح اسی کے ایک دوسرے فرقے کالونسٹ نے بھی سرمایہ پرست مہم جو طبقے کے مطلب کی باتیں کیں۔ حالانکہ اس سے پہلے کیتھولک چرچ ان تاجروں کو جو دولت کی ہوس کا شکار تھے گنہگار سمجھتا تھا۔(۹)

اس وجہ سے اب فرانس، برطانیہ اور جرمنی وغیرہ نے ایشاء اور افریقہ پر قبضے شروع کر دیئے۔ اور وہاں کے وسائل کے بے دردی سے لوٹنا شروع کیا۔ وہاں سے خام مال کو لوٹ کر سمندری جہازوں کے ذریعے اپنے اپنے ممالک میں پہنچاتے تھے اور پھر اسے مشین سے گزار کر دوبارہ یہ مصنوعات انہیں غریب ممالک کے باشندوں کے ہاتھوں مہنگے داموں بیچتے تھے۔ لیو پیو برمین اپنی کتاب یورپ امیر کیسے بنا میں لکھتے ہے۔

> امریکہ میں سونے اور چاندی کی دریافت، دیسی آبادی کی تباہی، زبردستی غلام بنانے کی مہم، قدیم دیسی باشندوں کی امریکی کانوں میں تدفین، ہندوستان اور ویسٹ انڈیز پر فاتحانہ یلغار اور ان کی لوٹ کھسوٹ، اور افریقہ کے براعظم کا کالی چمڑی کے لوگوں کی تجارت کے لیے شکارگاہ بننا، یہ وہ بنیادیں تھیں جن پر سرمایہ دارانہ نظام کے دور جدید کی عمارت کھڑی کی گئی۔(۱۰)

19 ویں صدی کے آخر تک دوسرے مغربی ممالک نے ایشاء اور افریقہ کے بچے کچے ممالک پر قبضہ کیا اور جنوبی امریکہ سے لیکر ہند تک اہل مغرب کا قبضہ ہوا۔ لیو پیو برمین اپنی کتاب یورپ امیر کیسے بنا میں لکھتے ہے۔

> اٹھارویں صدی کے وسط ترک انگلستان زیادہ تر ایک زراعتی ملک تھا۔ تقریباً ۱۷۶۰ء کے بعد سے اس ملک میں تیزی سے مشین ایجاد ہونا شروع ہو ہیں جنہوں نے ایک زبردست

انقلاب کی بنیادیں ڈالیں جو تاریخ میں صنعتی انقلاب کے نام سے مشہور ہے۔ حالانکہ انگلستان ایک طویل عرصے سے معاشی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا لیکن ذرائع پیداوار میں یہ ''ایجادیں''، ''یکا یک'' ایک مخصوص زمانے میں کیوں ظاہر ہوئیں؟ اس سوال کا جواب پام دت کی زبانی سنیئے:

''اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں جو لوٹ مچائی گئی اس کی بنیادوں پر جدید انگلستان کی تعمیر ہوئی۔ جب ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ ہوئی اور اس میں برطانیہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریشہ دوانیاں کر کے فتح حاصل کی تو اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان بند ٹوٹ گیا ہو۔ ہندوستان کی دولت سمندری طوفان کی طرح انگلستان میں آنے لگی۔ اس دولت کی فراوانی نے انگلستان میں ایجادات کے لیے فضا سازگار بنادی۔ پلاسی کی جنگ کے فوراً بعد انگلستان میں کئی بڑی بڑی چیزیں ایجاد ہوئیں جن سے صنعتی انقلاب برپا ہوا''۔(۱۱)

صنعتی انقلاب نے اگرچہ دنیا کو بہت کچھ دیا لوگوں کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کیں۔ میڈیکل کے دنیا میں نئے نئے انکشافات ہوئے۔ بہت ساری بیماریوں کے علاج دریافت ہوئے۔ لیکن نقصان یہ ہوا کہ اس انقلاب سے مغربی ممالک اور خصوصاً جاپان کے درمیان مادی دوڑ شروع ہوئی۔ جس سے ان ممالک کے درمیان دو عظیم جنگیں لڑی گئیں۔ پہلی جنگ عظیم 1914 سے 1918 تک لڑی گئی جسمیں کروڑوں لوگ مارے گئے۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم 1939 سے 1945 تک لڑی گئی۔ اس جنگ میں جرمن فوج کو شکست ہوئی۔ ہیروشما اور ناگاساپر ایٹم بم گراتے گئے۔ جس نے ان دو شہروں کو مکمل تباہ کیا۔ اس جنگ میں بھی کروڑوں لوگوں کو مارا گیا۔ جرمن تو مکمل تباہ ہو گیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اہل مغرب نے دو عظیم جنگیں لڑ کر دو دفعہ خودکشی کی ہے تو یہ کہنا بے جا نہ نہیں ہوگا۔ ایچ جی ویلز اپنی کتاب مختصر تاریخ عالم میں لکھتے ہیں:

تمام اقوام مسلح ہو گئیں۔ ہر گزرتے سال کے ساتھ انہوں نے، اوزاروں، جنگی جہازوں اور ایسے ہی دیگر اسلحہ کی تیاری کے لیے مختص قومی آمدنی کی شرح بڑھانی شروع کر دی۔ جبکہ ہر نیا سال صورت حال کے توازن کو جنگ کے مضبوط ہوتے امکان کی صورت بگاڑنے لگا۔

آخر وہ وقت ان پہنچا۔ جرمنی اور آسٹریا نے فرانس، روس اور سربیا پر دھاوا بول دیا۔ جرمن فوجیں بلجیم میں داخل ہوئیں تو برطانیہ فوراً بلجیم کی حمایت میں جنگ میں کود پڑا اور جاپان کو اپنا حلیف بنالیا۔ جلد ہی ترکی نے جرمنی کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اطالیہ نے ۱۹۱۵ء میں آسٹریا کے خلاف علم جنگ بلند کیا۔ اسی برس اکتوبر میں بلغاریہ مرکزی طاقتوں سے جا ملا۔ ۱۹۱۶ء میں رومانیہ اور ۱۹۱۷ء میں امریکہ اور چین بھی جنگ میں کود پڑے۔ اس مختصر تاریخ عالم میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ہم اس عظیم سانحہ کے وقوع میں مختلف اقوام کے قصور کا اندازہ لگائیں۔ دلچسپ سوال یہ نہیں ہے کہ یہ عظیم جنگ کیوں چھڑی بلکہ یہ ہے کہ اس کا پہلے سے اندازہ کیوں نہیں لگایا گیا اور اس کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی؟ یہ نوع انسان کے لیے کہیں زیادہ غور طلب بات ہے کہ تب کروڑہا لوگوں نے جو محبّ الوطن، یا احمق تھے اس تباہی کو روکنے کے لیے ان سب کی بجائے فقط چند لوگوں کا ہی مختصر گروہ فراخدلانہ اور بے تکلف انداز میں یورپی اتحاد کی تحریک کا علم اٹھائے ہوئے تھا۔ (۱۲)

بہر صورت بات صنعتی انقلاب کی ہو رہی تھی۔ اس انقلاب سے نئے پیداواری رشتے قائم ہوئے۔ اب جاگیردار نے سرمایہ دار کا روپ اختیار کرتے ہوئے کارخانے قائم کیئے۔ جس کے ذریعے اب وہ ہزاروں لاکھوں مزدوروں کی محنت کو اپنے منافع کیلئے استعمال کرنے لگا۔ سامراجیوں نے مذہب کو اپنی تجارتی مفادات کے تحفظ کے لئے آلہ کار بنالیا۔ رانا یوسف خان اپنی کتاب اشتراکیت کی چند نظریاتی پہلو میں لکھتے ہیں:

تقریباً چار پانچ سو سال پہلے سرمایہ داری کا آغاز ہوا، یورپ میں برطانیہ، ہالینڈ، پرتگال، سپین سب سے پہلے طاقتور ملک تھے ان ملکوں نے یورپ اور دنیا کے دوسرے ممالک جو سمندر کے پار تھے اپنی اپنی تجارت کا وسیع کاروبار پھیلایا ہوا تھا۔ اپنی ملکوں کی وجہ سے ان کے ملاحوں نے ہندوستان اور چین کے راستے اور امریکہ جیسا براعظم دریافت کیا۔ چین، ہندوستان اور امریکہ کو نوآباد بنا کر ان پر قبضہ کرلیا اور اس غیر ملکی لوٹ سے ان ممالک خصوصاً انگلینڈ میں دولت کے انبار جمع ہوگئے یورپ کی آپس کی جنگ و جدل نے بھی دولت کے مرتکز ہونے میں کردار ادا کیا۔ کیونکہ فاتح ملک مفتوح ملک کی دولت لوٹ کر اپنے ملک لے

کر جاتا ہے۔(۱۳)

تبلیغ عیسائیت کے نام پر ہزاروں پادری مفتوحہ ممالک میں بھیجے گئے اس کا مقصد یہ تھا کہ جب مفتوحہ قوم کے لوگ ہمارے ہم مذہب ہو جاتے ہیں تو جب ہم لوٹ مار کرینگے تو یہ بغاوت نہیں کریں گے۔ سامراجی ممالک نے مزاحمت کرنے والے افریقہ کے سینکڑوں قبیلوں کو ختم کیا۔

خاص کر امریکہ میں لال ہندویوں کا قتل عام کیا گورے انگریز جانوروں کی طرح ان کا شکار کرنے لگے اور حکومت کے طرف سے باقاعدہ ان کو انعامات ملتے تھے۔ انیسویں صدی میں بھی امریکہ میں غلامی کا رواج تھا۔ امریکہ میں لاکھوں کے حساب سے حبشی نسل کے لوگوں کو مارا گیا۔ ان کو بنیادی شہری حقوق سے محروم رکھا گیا۔ معمولی شک وشبہ پر ان کو آگ میں ڈالا جاتا۔ کانگو میں شاہ لیولڈ دوم نے جو ایک راسخ العقیدہ عیسائی اور ''انسان دوست'' خیال کیا جاتا تھا۔ حبشیوں کا اس نے بے دردی سے قتل عام کیا۔ کانگو کے حبشی باشندوں کی آبادی دو کروڑ سے گھٹ کر نوے لاکھ تک پہنچ گئی۔ جنوبی امریکہ میں ہسپانوی لیٹروں نے لاکھوں دیسیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور ان کے بیٹے اور بیٹیوں کو غلام بنالیا گیا۔ انگلستان میں کوئلے کی کان میں بیس بیس گھنٹے مزدوری سے کام لیا جاتا۔ جس میں ہزاروں مزدور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ انگریز جو انسانی حقوق کیلئے پوری دنیا میں شور مچا رہے تھے اور خود ذرا برابر ان پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ یورپ میں عورتوں، مردوں اور بچوں سے کوئلے کے کانوں میں سخت کام لیا جاتا اور عورتوں کے گردنوں کو رسیوں کے جواء میں جکڑ کر ان سے کوئلے کی لدی ہوئی کشتیوں کو دریا کے کنارے کھینچنے کا کام لیا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کی حالت زار پر کبھی توجہ نہیں دی۔ کیونکہ ان کے منافع میں کمی کا خدشہ تھا۔ یہ ایک المیہ تھا کہ ایک طرف انگریز پوری دنیا میں شور مچا رہے تھے کہ مزدوروں کو اپنے حقوق دو۔ اور دوسری طرف اپنے کارخانوں میں ان کے اوپر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ اس وجہ سے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ان کی کوئی اخلاقیات نہیں ہوتی۔ قوم، وطن اور انسانیت ان کے آئین میں نہیں ہوتے۔ ان کے اپنی ایک قوم جو دنیا بھر کے استحصال کرنے والوں منافع خوروں اور سود خوروں پر مشتمل ہے وہ اپنے مادی مفادات کیلئے اپنے دشمن کے طرف بھی ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔ وہ محض عوام کو دھوکہ دینے کیلئے مذہب، اخلاق، انسان دوستی، رفاہ عامہ یا آزادی رائے کی بات کرتے ہیں اور اپنے معاشی غلبے کو قائم رکھنے کیلئے ہر قسم کی گھٹیا حربے استعمال کرنے سے نہیں چوکتے۔

صنعتی انقلاب سے اب سرمایہ داروں نے مزید نجی املاک کوفروغ دیا۔اور ہر جگہ کارخانوں کا جال بچھانا شروع کیا۔جس سے چھوٹے کارخانے اور کاروبار سکڑ گئے یا مکمل طور پر ختم ہو گئے ۔زمینوں کی قیمتیں اس دوڑ میں اتنی بڑھ گئی کہ اب مزدور بندے کیلئے زمین کا معمولی سا ٹکڑا حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔معاشرے کے پیداواری قوتوں کو پہنچنے کا موقع نہیں دیا گیا۔

سرمایہ داروں نے ذاتی فائدے کیلئے معاشرے کی اجتماعی ضرورتوں کونظر انداز کیا جس کا نقصان یہ ہوا کہ ایک طرف سرمایہ دار مالدار سے مالدار تر ہو رہے تھے جبکہ دوسری طرف محنت کشوں کی زبوں حالی،غربت وافلاس اور بے روزگاری میں اضافہ ہوتا گیا۔جن ممالک میں اشتراکی نظام قائم کر دیا گیا وہاں نجی ملکیت کوختم کیا گیا اور ذرائع پیداوار مشترکہ ملکیت ٹھہری۔جس سے استحصال کا خاتمہ کر دیا گیا۔طبقاتی کشمکش کے ختم کرنے اور پیداواری رشتوں میں مفاہمت ہو جانے کے باعث پیداواری قوتوں کی نشوونما میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی اور شخصی اور اجتماعی مفادات میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے اب ممالک میں غربت وجہالت،مہنگائی افراط زر اور بے روزگاری ختم ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام میں سارا جھکاؤ ایک طرف ہو گیا۔کارخانہ دار اور مزدور میں وہی نفرت اور عداوت موجود ہے جو کبھی آقا اور غلام میں ہوتی تھی پھر مضارع اور جاگیردار میں شروع ہو گئی اور اب سرمایہ دار اور مزدور کے مابین یہ آویزش جاری ہو گئی۔اس وجہ سے سرمایہ دارانہ ممالک میں خلفشار وانتشار بڑھ گیا۔سرمایہ دار آج بھی جدید صنعتی معاشرے میں زرعی معاشرے کی پرانی اور فرسودہ استحصالی قدریں باقی وبحال رکھنے پر بضد ہیں۔جن سے ان کا معاشرہ تضادات کا شکار ہو کر تنزل پذیر ہو۔انیسویں صدی تک مغربی ممالک کا یہ وطیرہ رہا تھا کہ وہ براہ راست دنیا کے پسماندہ ممالک پر حملہ آور ہوتے تھے اور وہاں نوآبادیاں قائم کرتے تھے۔اور وہاں کے وسائل کو بے دریغ لوٹ رہے تھے اور اپنے کارخانوں کیلئے دھڑا دھڑ خام مال سمندری جہازوں کے ذریعے اپنے ممالک میں بھیج رہے تھے۔اب ان کا نیا وطیرہ ہے کہ دنیا کے غریب ممالک کو قرضوں میں جکڑ دو اور اس طرح ان کو سود در سود قرضوں سے لوٹتے رہو۔

i۔ پرولتاریہ

پرولتاریہ کے لغوی معنی ہیں (بہت سی اولاد رکھنے والے یعنی غریب) کی خوش قسمتی سے انہیں کارل مارکس اینجلز،لینن اور ماوزے تنگ جیسے عظیم رہنما اور قائدین ملے تاریخ میں پہلی دفعہ مزدوروں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ قیادت ملی

جس نے تاریخ کا سائنسی بنیادوں پر مطالعہ کیا۔ جو بیک وقت مفکر بھی تھے اور مردانِ عمل بھی تھے۔ کارل مارکس اور اینجلز نے 1848ء میں اپنا انقلابی منشور پیش کیا۔ اور دنیا بھر کے محنت کشوں کو متحد کر کے سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ مزدور کارخانے میں قدر زائد پیدا کرتا ہے۔ وہی جمع ہو کر سرمایہ داروں کی دولت بن جاتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آشاشہ جات کو مزید توسیع دیتا ہے۔ انہوں نے محنت کشوں کو منشور دیا اور ان کو انقلاب پہ ابھارا اور ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی کہ سرمایہ دارانہ نظام کا زوال یقینی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ دنیا کے عظیم ممالک میں لینن اور ماوزے تنگ کی قیادت میں مزدوروں کا انقلاب برپا ہو گیا جس سے تاریخ عالم میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ پوری دنیا میں سرمایہ داروں کے خلاف مزاحمتیں شروع ہوئیں۔ بورژوا طبقے کے خلاف نفرت بڑھنی لگی اور روس سمیت دنیا کے درجن بھر ممالک میں اس نظام کے خلاف بغاوتیں ہونی لگی۔

ii۔ اشتراکیت

اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام کے ردعمل میں وجود میں آئی۔ اس فلسفے کا بانی ایک جرمن معشیت دان کارل مارکس (1818-1883) تھا۔ جس نے پہلی بار سرمایہ دارانہ نظام کے پورے فلسفے کو چیلنج کیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کا یہ دعویٰ تھا کہ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ زیادہ سے زیادہ نجی ملکیت بنائے۔ اور معشیت کا ہر مسئلہ صرف طلب و رسد کی بنا پر حل کیا جائے۔ مارکسی فلسفے میں اس نظام کے خلاف بے انتہا نفرت پائی جاتی ہے کیونکہ اس نظام میں ملک کی ساری دولت پر چند لوگوں کا قبضہ ہو جاتا ہے جنہیں مارکس نے بورژوا طبقہ کہا۔

علی عباس جلال پوری اپنی کتاب خردنامہ جلالپوری میں لکھتا ہے۔

> بورژوا'' لفظ بورژ سے مشتق ہے جس کے معنی ہے منڈی۔ اس لئے تجارت پیشہ کو بورژوا کہنے لگے سیاسیات کی اصطلاح میں صنعت کار، ساہوکار، جاگیردار، اجارہ دار اور بڑے بڑے تاجر سبھی بورژوا میں شامل ہیں جو محنت کشوں کا استحصال کر کے دولت سمیٹتے ہیں (۱۵)

جبکہ دوسرا طبقہ مزدور کا ہے جس کو پرولتاریہ کہا جاتا ہے۔ علی عباس جلال پوری اپنی کتاب خردنامہ جلالپوری میں لکھتے ہیں۔

محنت کش طبقے کو سیاسیات کی اصطلاح میں پرولتاری کہتے ہیں۔اس ترکیب کا لغوی معنی ہے۔''وہ شخص جس کی کثرت سے اولاد ہو''(۱۶)

بورژوا طبقہ جو ذرائع پیداوار پر قابض ہے جو مزدوری سے کم اجرت پر کام لیتا ہے لیکن بدقسمتی سے ان مزدوروں کی ساری صلاحتیں صرف چند افراد کیلئے ہوتی ہے۔مزدور وہ غلام ہوتے ہیں جن کو زندہ رہنے کیلئے اپنی ساری طاقت وصلاحیت بورژوا طبقے کیلئے استعمال کرنی پڑتی ہے۔اس کی وضاحت کیلئے ایک مثال دی جاتی ہے۔ اگر مزدوروں کی رسد زیادہ ہو تو ان کی اجرت کم ہو جاتی ہے اور بسا اوقات مزدور اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ نہایت کم اجرت پر''بورژوا'' طبقے کو اپنے خدمات پیش کریں اور جو پیداوار ان کے گاڑھے پسینے سے پیدا ہوتی ہے اس میں سے اتنا بھی حصہ نہیں ملتا کہ وہ اپنے بچوں کو کم از کم بنیادی ضروریات زندگی مہیا کر سکیں۔ چونکہ سرمایہ دار کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ مزدور کے بچے بھوک سے مر رہے ہیں۔مزدوروں کے زیادہ رسد سے وہ اپنی ضرورت کی تسکین کرتا ہے جس سے اس کے منافع میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس لئے اشتراکیت نے آمدنی کی تقسیم کیلئے طلب ورسد کے اس قانون کو استحصالی، بے حس و بے جاں قرار دیا ہے۔مارکس اور اینگلز نے اس قانون کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔اشتراکیت کا نعرہ تھا''دنیا کے مزدوروں ایک ہو جاؤ''اس کیلئے ایک اصطلاح استعمال کی جانے لگی جس کو''پرولتاری بین لاقومیت'' کہا جاتا ہے۔جب مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی تنظیم لندن میں بنی تو اینگلز نے ایک مضمون''لندن میں قوموں کا تہوار'' کے نام سے پڑھا۔اس مضمون میں وہ پرولتاری بین الاقوامیت کے اصولوں کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> ساری دنیا کے محنت کشوں کے مفادات ایک ہیں، ان کا دشمن بھی ایک ہے۔اور ان کو ہر قسم کی جدوجہد درپیش ہے۔محنت کشوں کی اکثریت قومی تعصّبات سے بری ہے۔ان کی ساری ترقی اور تحریک بنیادی طور پر انسان دوست ہے اور قوم پرستی سے ماورا۔فقط مزدور ہی قومیت کی تنسیخ کر سکتے ہیں۔فقط بیدار ہوتے ہوتے محنت کار ہی مختلف قوموں میں بھائی چارہ پیدا کر سکتے ہیں۔(۱۷)

مارکس اور اینگلز کا کہنا ہے کہ ریاست کی مثال''ماں'' جیسی ہوتی ہے۔جو ملک کے ہر شہری کے ساتھ خواہ وہ دولت مند ہوں یا غریب یکساں سلوک کرتی ہے۔ ریاست بلا امتیاز رنگ و مذہب سب شہریوں کی حفاظت کرتی

ہے۔اس طرح ریاست کا کام ہے ملک کے شہریوں کو بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنا۔ بیرونی حملہ آوروں سے حفاظت اور ملک میں امن وامان قائم ہے۔لیکن جب مارکس اور اینگلز نے تاریخ کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ریاست کو ہمیشہ سے ''بورژوا'' طبقے نے غریبوں کو دبانے کیلئے استعمال کیا ہے۔ریاستیں ذاتی ملکیت کی حفاظت کے لئے وجود میں آتی ہیں دنیا کی معلوم تاریخ میں ریاست کا یہی کردار رہا ہے موجودہ نظام میں ذرائع پیداوار چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔سرمایہ دار اپنے کارخانوں میں مال تیار کرتا ہے۔اس مال کو وہ بیچ کر صرف وہ نفع اور سرمایہ میں اضافہ چاہتا ہے تاکہ ضرورت پوری کرتا ہے۔اس کے مقابلے میں سوشلسٹ سویت ہوتا ہے۔جس کا کام ملک میں جمہوری انداز میں یہ منصوبہ بندی کرنی ہوتی ہے۔کہ معاشرے میں کس چیز کی کتنی ضرورت ہے؟ اور اسے کس طرح پورا کرنا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ سوشلزم کو سماج کی سائنس اور سوشلسٹوں کو سماجی سائنسدان کہتے ہیں۔اس سماجی سائنس کو پہلی بار کارل مارکس نے صحیح سائنسی انداز میں دیکھا۔کارل مارکس نے اپنے دوست اینگلز کے ساتھ سوشلسٹ اقتصادی سائنس اور سماج کو تبدیل کرنے کیلئے سب سے پہلے قوانین پیش کئے اور پھر اسی انقلابی خیالات کو سامنے رکھ کر 1917ء میں روس میں ''پرولتاری'' طبقے نے لینن کی راہنمائی میں انقلاب برپا کیا اور دنیا میں پہلی سوشلسٹ ریاست قائم کی۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مارکس اور اینگلز نے جو خیالات پیش کئے تھے وہ خیالی نہیں بلکہ قابل عمل تھے۔مارکس سے پہلے بھی ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے اسی طرح خیالات پیش کئے اور سوشلسٹ کہلائے سبط حسن کے مطابق:

> مارکس اور اینگلز نے اپنے اشتراکی نظریوں کیلئے سائنسی سوشلزم کی اصطلاح اور پرانی سوشلزم کیلئے خیالی سوشلزم کی اصطلاح وضع کی تھی۔خیالی سوشلزم سے ان کی مراد سماجی اصلاح کے وہ منصوبے تھے جو یورپ کے مفکرین وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے تھے یہ منصوبے معاشرے کے معروضی حالات سے اخذ نہیں کئے گئے تھے بلکہ ان مفکرین کی ذاتی خواہشوں کا عکس تھے۔اس کے برعکس سائنسی شلزم سرمایہ داری نظام کے معروضی حالات کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا۔اس کے اصول ارتقاء بالخصوص سرمایہ داری نظام کے گہرے مطالعے سے اخذ کیے گئے تھے۔سائنسی سوشلزم سے مراد وہ سماجی نظام ہے جس میں پیداوار کے تمام ذرائع زمین اور معدنیات، کارخانے، فیکٹریاں، بینک تجارت وغیرہ معاشرے کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔اور ان کی پیداوار جسمانی اور ذہنی کام کرنے والوں کی تخلیقی محنت کے مطابق

تقسیم کی جاتی ہے۔ کمیونزم، سائنسی سوشلزم کا اگلا قدم ہے اس سے مراد وہ اشتراکی نظام ہے جس میں پیداوار قوتیں اور پیداوار دونوں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ اشیائے صرف کے استعمال کا پیمانہ افراد کی محنت نہیں ہوتا بلکہ ان کی ضرورت ہوتا ہے (۱۸)

مارکس سے پہلے جتنے سوشلسٹ تھے وہ خیالی سوشلسٹ تھے جبکہ مارکس سائنسی سوشلسٹ تھا اس نے جو فلسفہ پیش کیا ہے اس کو دیکھا بھی جاسکتا ہے اور پرکھا بھی جاسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں خیالی سوشلسٹ غیر سائنسی طریقے سے معاشرے کو سدھارنا چاہتے تھے۔ سائنسی سوشلزم کو سمجھنے کیلئے تاریخی مادیت، جدلیاتی مادیت اور مارکسی معیشت ضروری عوامل ہوتے ہیں۔

مارکس کی تعلیمات پر پہلا سویت یونین انقلاب

سماج کے آغاز و ارتقاء میں بنی نوع انسان مختلف سماجی تاریخی ارتقاء کے دور سے گذرتا ہوا سرمایہ داری کے ترقی یافتہ سامراجیت میں پہنچا۔ جس کی تفصیل پیچھے صفحات پر بیان ہوگئی ہے کہ سرمایہ داری نظام میں سماجی ارتقاء جاگیرداری سے ہوا اور پھر سرمایہ داری جب اپنے عروج کو پہنچی تو اشتراکیت نے اس کی جگہ لی۔ اشتراکیت کا پہلا تجربہ روس میں ہوا۔ جس کی پیش گوئی خود کارل مارکس نے کی تھی۔ اس انقلاب میں کلیدی کردار لینن نے ادا کیا۔ لینن ایک روشن خیال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا یا روشن خیال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ان کے والد روشن خیال اور خردمند آدمی تھا۔ لینن کے بھائی کو حکومت نے انقلابی سرگرمیوں کے پاداش میں سزا دی جس کی وجہ سے لینن نے عزم کیا کہ اس ظلم و جبر کے خلاف لڑے گا۔ لینن نے مارکسی ادب اور مارکس کے معاشی تھیوری کا بغور مطالعہ کیا۔ مارکسیت کے طرف مائل کرنے میں پروفیسر نکولائی کا اہم کردار تھا۔ اس نے ایک خفیہ تنظیم بنائی جسمیں وہ لڑکوں کو مارکسیت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ لینن اس تنظیم کا روح رواں بن گیا اور اس پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مارکس کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے جبر و استحصال کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں پولیس نے اس کو گرفتار کیا۔

1892ء میں لینن نے قانون کی سند لی۔ لیکن وکالت کرنے کے بجائے اس نے اپنی زندگی انقلابی سرگرمیوں کے لئے وقف کردی۔ اس نے مارکسی حلقے کی بنیاد رکھی جو پُر جوش نوجوان انقلابی تھے سینٹ پیٹرز برگ میں اس نے مزدوروں کو متحرک کیا انہیں ان کے حقوق کے بارے میں سمجھاتا رہا۔ اور ان کے سیاسی تربیت کیلئے دن رات کوشش کرنے لگا۔ اس نے مزدوروں کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس طرح کے انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں

لینن کو 1893ء میں سائبریا جیل بھیج دیا گیا۔ ایک دوسری انقلابی کرپس کا یا جو ایک خردمند خاتون اور مزدوروں کے بچوں کو پڑھاتی تھی، اس عورت کو بھی جلا وطن کیا گیا۔ اس جلاوطنی کے دوران اس نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا۔ 1900ء میں سزا مکمل کرنے کے بعد جب اس کو رہائی ملی تو حکومت نے سینٹ پیٹرز برگ میں اس کی رہائش پر پابندی لگادی جس کی وجہ سے اس کو مضافات میں رہنے دیا گیا۔ خفیہ پولیس کی مسلسل نگرانی سے تنگ آ کر لینن فرانس فرار ہوگیا۔ جہاں اس نے انقلابی سرگرمیاں کافی زور شور کے ساتھ جاری رکھیں اور ایک رسالہ ''آسکر'' جاری کیا۔ 1912ء میں یہ جریدہ لندن گیا اور اس جریدے میں انقلابی مضامین لکھے اور محنت کشوں کے مسائل کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ لینن کا کہنا تھا کہ ہم ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں کہ جس میں امیر وغریب برابر ہوگا اور سب لوگوں کو کام کرنا پڑے گا۔ محنت کا ثمر چند افراد کے جیبوں میں نہیں جائے گا۔ بلکہ سب لوگ برابر اس سے مستفید ہونگے۔ چند لوگوں کو ہم اجازت نہیں دینگے کہ وہ ہزاروں لوگوں کی محنت پر عیاشی کریں یہ معاشرہ اشتراکی معاشرہ کہلائے گا۔

لینن نے یورپ میں زور وشور کے ساتھ انقلابی کام کو جاری وساری رکھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ مزدوروں کے حقوق پرولتاری آمریت قائم ہونے کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔ مارکس، اینگلس اور لینن اپنی کتاب کمیونسٹ سماج میں لکھتے ہیں:

> پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ ہی ظالموں کی سرکوبی کے لیے حکمران طبقے کی حیثیت سے مظلوموں کے ہراول کی تنظیم محض جمہوریت کے توسیع نہیں کرسکتی۔ جمہوریت کی زبردست توسیع کے ساتھ ہی ساتھ جو پہلی غریبوں کے لیے جمہوریت، عوام کے لیے جمہوریت کی شکل اختیار کرتی ہے زرداروں کے لیے جمہوریت کی نہیں، پرولتاریہ کی ڈکٹیرشپ ظالموں استحصال کرنے والوں، سرمایہ داروں پر سلسلے وار پابندیوں کو عائد کردیتی ہے۔ (۱۹)

ان کا کہنا تھا کہ انقلابی تحریک کو مزدوروں اور کسانوں کی مدد سے ہی کامیاب کیا جاسکتا ہے۔ 1903ء میں جب پارٹی کا دوسرا اجلاس ہوا تو اس میں لینن کے ہم خیال لوگوں کی اکثریت ہوئی جس کو ''بالشویک'' کہا گیا۔ اور جو دوسرا دھڑا بنا جو لینن کے طریقہ کار سے اختلاف کرتا ہے اس کا نام منشولیک یعنی (اقلیت والے)۔

دسمبر 1905ء میں ماسکو میں مزدوروں نے بغاوت کی اور اس میں کسانوں نے بھی حصہ لیا۔ ڈاکٹر ظ۔

انصاری اپنی کتاب لینن سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> روس میں انقلابی تحریک تیزی سے بڑھی۔ ۱۹۰۵ء کی بہار اور گرمیوں میں پیٹر برگ، وارسا، لودزم باکو اور اودیسا جیسے صنعتی مرکزوں میں بڑی بڑی ہڑتالیں ہوئیں۔ کسان تحریک روس کے سارے اضلاع میں پھیل گئی۔ زار شاہی کے جنگی ستونوں یعنی فوج میں بھی تزلزل پیدا ہوگیا۔ جون ۱۹۰۵ء میں بحرہ اسود کے بڑے جنگی جہاز ''پوتیومکن'' پر ملاحوں نے بغاوت کر دی۔ لینن نے اس بغاوت کو بڑی اہمیت دی۔ (۲۰)

لیکن زار حکومت نے ان کو سختی سے کچل دیا۔ اس وجہ سے لینن کو دوبارہ وطن چھوڑنا پڑا۔ اس عرصے میں انقلابی لوگوں کو مارا گیا۔ سائبریا جیل بھیجا گیا اور ہر طرح ان کو کچل دیا گیا۔ لیکن لینن پورے اعتماد کے ساتھ تنظیمی کاموں میں لگا رہا۔

1912ء میں بالشویکوں نے سینٹ پیٹرز برگ سے ایک جریدہ پراودا نکالا۔ جس میں لینن نے تسلسل کے ساتھ سینکڑوں مضامین لکھے۔ 1912ء سے 1914ء تک اس جریدے میں لینن نے دوسواسی 280 کے قریب مضامین لکھے جس کو ملک بھر میں لوگوں نے پڑھا۔ پہلی جنگ عظیم 1914ء میں شروع ہوئی۔ جس پر لینن نے سخت تنقید کی۔ لینن کا یہ کہنا کہ یہ نوآبادیاتیوں کو تقسیم کرنے کی لڑائی ہے۔ جسمیں لاکھوں محنت کشوں کو وطنیت کے نام پر آگ میں دھکیل رہے ہیں۔ کم وبیش دس برس کی جلاوطنی کے بعد لینن 3 اپریل 1917ء کو پیٹر گارڈ پہنچ گیا۔ جہاں انقلاب پسندوں نے پورے جذبے کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ حکومت نے ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے۔ لینن بھیس بدل کر فن لینڈ چلا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد جب وہ واپس آیا تو اس کی جماعت نے مسلح بغاوت کے ذریعے زار شاہی کے تحت کو الٹ دیا اور حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح اکتوبر انقلاب برپا ہوا۔ جس کے لیے انقلاب پسند کئی دہائیوں سے کوشش کررہے تھے۔ مارکس اپنی کتاب کیمونسٹ سماج میں لکھا ہے:

> اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب طاقتور، جاندار اور ناقابل تسخیر ہے کیونکہ وہ ان خوبیوں کو بیدار کرتا ہے، پرانی رکاوٹوں کو توڑ ڈالتا ہے، گھسی پٹی بیڑیوں کو کاٹ دیتا ہے اور محنت کش عوام کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں ایک نئی زندگی کو خود مختارانہ تخلیق کی شاہراہ پر لے جاتا ہے۔ (۲۱)

تاریخ عالم ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ دنیا بھر میں ایک شور مچ گیا۔ سرمایہ داروں کی نیندیں پہلے دن سے حرام ہوگئی تھیں۔ کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ یہ انقلاب ہمارے دروازوں پر دستک دے گا۔ سرمایہ داروں نے پہلے دن سے لیکر اس انقلاب کے خلاف سازشیں شروع کی۔ لیکن انقلاب کو کون روک سکتا ہے یہ پھیلتا گیا۔ سینکڑوں قومتیوں کا ایک مشترکہ وطن بن گیا جس کو ''سویت یونین'' کہا جانے لگا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری اپنی کتاب لیـــنـــن سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> جب لینن ڈائس پر آئے تو سارے ہال کے لوگ کھڑے ہوگئے اور ڈائس کی طرف بڑھنے لگے جہاں لینن کھڑے تھے۔ وہ دیر تک اپنی تقریر شروع نہ کر سکے کیونکہ تالیاں اور ''لینن زندہ باد'' کے نعرے نہیں رک رہے تھے۔ ہال میں نہ صرف کانگرس کے مندوبین تھے بلکہ اسمونسی میں موجود مزدوروں، سپاہیوں اور ملاحوں کی موجودگی سے وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ کھڑکیوں، ستونوں کے قدمیجوں میں کھڑے تھے تاکہ ڈائس پر کھڑے لینن کو دیکھ لیں۔ ہوا میں ملاحوں اور دوسرے لوگوں کی طرح طرح کی ٹوپیاں اچھالی جارہی تھیں اور اوپر اٹھی ہوئی ہنگین چمک رہی تھیں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے کانگرس نے لینن کی امن بارے میں تقریر سنی۔ (۲۲)

اس موقع پر لینن نے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے یہ اقدام اٹھایا کہ ہم نے کرۂ ارض کے ایک کونے میں روندے ہوئے سرمایہ کو کچل کر رکھ دیا۔ جس کی خون ریزی سے پوری دنیا لالہ زار بن گئی ہے۔ جس نے بنی نوع انسان کو بھوک کے ہاتھوں مارا ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری اپنی کتاب لینن سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> زمین کے فرمان نے زمین پر جاگیرداروں کی ملکیت کا ہمیشہ کے لیے بلا معاوضہ خاتمہ کر کے اس کو عوام کو دے دیا۔ کسانوں کے ہاتھ میں کوئی ۱۵ کڑور ہیکڑ سے زیادہ زمین آگئی۔ اس بات نے عملی جامہ پہنا جس کے خواب کسان صدیوں سے دیکھ رہے تھے اور جدوجہد کر رہے تھے۔ لینن کے خرمان کے مطابق زمین پر نجی ملکیت کی جگہ عوامی، ریاستی ملکیت نے لی جس نے بعد میں سوشلسٹ بنیادوں پر زراعت کی تعمیر نو کو آسان کر دیا۔ کانگرس کے نمائندوں نے طوفانی تالیوں کی گونج میں زمین کے فرمان کی تصدیق کی۔ تو ہر صوبے کے

کسان نمائندے نے اپنی تقریر میں لینن کا مرتب کسانوں کے زبردست محافظ کی ۔۔۔۔ سے شکریہ ادا کیا۔

سوویتوں کی دوسری کانگرس نے مزدوروں اور سپاہیوں کے نمائندوں کی سوویتوں کی کل روس مرکزی انتظامیہ کمیٹی منتخب کی اور حکومت یعنی کمہاروں کی سویت کی تشکیل کی۔عوامی کمہاروں کی سوویت کے صدر لینن منتخب ہوئے۔ ملک کی رہنمائی کے لیے عوام نے بامتو ہک پارٹی پر اعتماد کیا جو ہمیشہ استقلال اور ایثار کے ساتھ ان کے مفادات کے لیے لڑتی رہی تھی۔ دنیا کے پہلی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت لینن کی سربراہی میں قائم کی۔(۲۳)

دنیا بھر کے انسان دوست حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔کئی یورپ ممالک اس انقلاب کے زد میں آئے۔عرب ممالک میں بھی ہلچل مچی۔دنیا دو بلاکوں میں تقسیم ہوگئی۔

لینن نے پہلے دن سے ہی اپنے انقلابی منصوبوں پر عمل درآمد شروع کیا اور محنت کشوں کے حقوق کا اعلان کیا۔جو بعد میں سویت آئین کی بنیاد بن گیا۔ڈاکٹر ظ۔انصاری اپنی کتاب لینن سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

مختصر مدت میں ملک میں بنیادی سیاسی اور معاشی تبدیلیاں کی گئیں۔سوویت یونین نے پہلے ہی دن پیداوار اور تقسیم پر مزدوروں کے کنٹرول کی کمیٹی تجویز پر غور کر کے عمل شروع کیا۔ مزدوروں اور ملازمین کے منتخب شدہ نمائندوں کو اپنے اداروں کے تمام کام کی نگرانی کرنے اور خلل اندازی کو روکنے کا اختیار دیا۔مزدور طبقے نے اس بات کی طرف پہلا قدم اٹھایا کہ وہ پیداوار کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔

پرانی فوج کو سبکدوش کرنے،سماجی پرتوں میں باشندوں کی تقسیم ختم کرانے،صاحب جائیداد طبقون کے خصوصی حقوق منسوخ کرنے کے لیے فرمان جاری کیے گئے۔ریلوے،تجارتی، بحری بیڑے اور بینکوں کو عوام کی ملکیت قرار دیا گیا۔ساری پرانی تجارت ریاست کے ہاتھ میں آگئی۔جلد ہی بڑے بڑے سرمایہ داروں کے کارخانے اور فیکٹریاں ضبط کر لی گئیں اور وہ بھی عوام ملکیت بن گئیں۔ان اقدامات کے ذریعہ سوویت ریاست نے ''سوشلزم نظام کے

گہرے انقلابی اور جمہوری مافیہ کا واضح طور پر اظہار کیا۔

سوویت یونین کے سارے ادارے، عوامی کمہاریت براہ راست لینن کی رہنمائی میں قائم کیے گئے۔ ''لینن نے محنت کشوں اور استحصال کے شکار لوگوں کے حقوق کا اعلان نامہ'' لکھا جس نے پہلے سوویت آئین کے لیے بنیاد فراہم کی۔ اس میں روس کی تمام قوموں کے لیے مکمل مساوی حقوق کا اعلان کیا گیا۔ تمام قوموں کو حق خودارادیت کی ضمانت علیحدگی اور اپنی خودمختار ریاست کی تشکیل کرنے کی حد تک دی گئی۔ اس اعلان نے سوویتوں کے ملک کی قوموں میں انمٹ دوستی کی مضبوط بنیاد ڈالی۔ (۲۴)

انقلاب روس کے بعد یورپ کی سامراجی طاقتوں نے ملکر روس پر چاروں طرف سے حملہ کیا۔ خطرناک اور نازک صورتحال تھی کیونکہ ایک ایسے ملک میں جس کے اسی فیصد سے زیادہ لوگ بھوک و افلاس کی زندگی گزار رہے ہوں اور اس میں نیا انقلاب آیا ہو۔ انقلاب کے بعد ہزاروں مشکلات تھیں۔ ملک کے آئین کا مسئلہ تھا۔ نئی اور منتظم فوج کی ضرورت تھی اور از سرِ نو تمام مسائل کا حل تلاش کرنا تھا ایسے نازک وقت میں یورپ کے چالاک سامراجیوں نے سویت یونین پر چاروں طرف سے ہلہ بول دیا۔ لیکن لینن کی قیادت میں کسانوں اور محنت کشوں کے عظیم الشان مزاحمت نے اس حملے کو ناکام بنایا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری اپنی کتاب لینن سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

سوویت ملک کو زبردست خطرہ درپیش تھا۔ لینن اور پارٹی نے فوراً دفاع کا انتظام کیا۔ ۲۱ فروری ۱۹۱۸ء کو لینن نے عوامی کمہاروں کی کونسل کیطرف سے عوام کے نام ایک جوشیلی اپیل ''سوشلسٹ وطن خطرے میں ہے'' لکھی۔ اس اپیل میں کہا گیا تھا کہ ''روس کے مزدوروں اور کسانوں کا یہ مقدس فرض ہے کہ وہ جان نثاری کے ساتھ بورژوا سامراجی جرمنی کی فوج سے ریپبلک کی حفاظت کریں۔'' لینن نے کہا کہ ساری طاقتیں اور وسائل دفاع کے کام میں لگا دیئے جائیں لیڈر کی اس اپیل نے محنت کش عوام میں زوردار انقلابی لہر پیدا کر دی۔ مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے بڑے بڑے جلسے ہوئے۔ ہر طرف انقلابی لوگوں کی نئی فوج کے دستے منظم ہونے لگے جنہوں نے بہادری کے ساتھ حملہ آور دشمن کا مقابلہ کیا اور اس پر ضرب کاری لگائی جیسے ناروا اور پسکوف میں ہوا تھا۔ ان واقعات کی یاد میں ہمارے

عوام ۲۳ فروری کو اپنی مسلح طاقت کا شاندار سے تہوار مناتے ہیں۔(۲۵)

لینن نے سویت روس کی صنعتی اور معاشی ترقی کیلئے عظیم منصوبے بنائے لیکن ان پر عمل درآمد کا موقع صحیح طرح نہیں ملا۔ کیونکہ ایک عورت نے لینن پر زہریلی گولی چلائی ایک گولی لینن کے کندھے میں دوسری اس کے پھیپھڑوں میں پھنس گئی جب ڈاکٹر ان کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے تو لینن نے مسکرا کر کہا'' کہ کوئی بات نہیں انقلابیوں کو ایسے حالات پیش آیا کرتے ہیں'' ڈاکٹروں کی کاوشوں کے باوجود اس کے پھیپھڑے سے گولی نہ نکل سکی کچھ روز آرام کے بعد دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے تعمیری ملکی کاموں میں لگ گیا۔ وہ کئی برس تک اپنی طویل اور دردناک علالت کا مردارانہ مقابلہ کرتا رہا اور بالآخر جنوری 1924ء اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ڈاکٹر ظ۔انصاری اپنی کتاب لینن سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء کی شام کو ۶ بجے کر ۵۰ منٹ پر دماغ میں سپلان خون کی وجہ سے لینن کا انتقال ہوگیا۔ ۲۱، ۲۲ جنوری کی درمیانی رات میں پارٹی کی انتظامیہ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس نے عوام کے نام ایک اپیل شائع کی۔ اس اپیل میں کہا گیا تھا۔ وہ انسان مرگیا جس کی مجاہدانہ قیادت میں ہماری بارود کے دھویں میں پتی ہوئی پارٹی نے مضبوط ہاتھ سے ہمارے ملک میں اکتوبر انقلاب کا سرخ پرچم لہرایا۔ بہادری کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کیا اور سابق زارشاہی روس میں محنت کشوں کا مضبوط اقتدار قائم کیا۔ کمیونسٹ پارٹی کا بانی، عالمی کمیونزم کا لیڈر بین الاقوامی پرولتاریہ کا پیارا اور اس کے لیے باعث فخر، مشرق کے مظلوموں کا علمبردار اور روس میں مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ کا سربراہ مرگیا۔(۲۶)

سویت یونین کی معاشی، سائنسی اور دفاعی میدان میں کامیابیاں

انقلاب سے پہلے روس سرزمین کو گنواروں کا ملک کہا جاتا تھا۔ اگرچہ پیٹر اعظم نے ملک میں مغرب طرز کی تعلیم و تحقیق کو عام کرنے کیلئے کام کیا لیکن روس اتنا پسماندہ ملک تھا کہ اس طرح کی کوششوں سے وہاں کی عوام کی زندگی نہیں بدلی جاسکتی۔ اکثر لوگ سخت مشقت کرتے اور اتنی محنت کے باوجود ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا کہ پیٹ بھر کہ روٹی کھا سکیں۔ اگرچہ ملک میں قدرتی وسائل بہت زیادہ تھے لیکن حکومت وقت کی طرف منصوبہ بندی نہیں تھی۔ وہ زار خاندان کی حکومت تھی۔ جن کا کام بس یہ رہ گیا کہ دن بدن کسانوں اور مزدوروں پر سختی کریں۔

انقلابیوں کو گرفتار کر کے ماریں یا پھر سائبریا بھیج دیں۔ روز بہ روز اپنی خاندانی حکومت کو مضبوط کریں۔ زرعی زمین ساری کی ساری جاگیرداروں کے قبضے میں تھیں ان زمینوں میں غلاموں سے سخت کام لیا جاتا کہ پھر غلاموں کے گاڑھے پسینے سے تیار کردہ کمائی پر جاگیردار عیش وعشرت کرتے ہوئے زندگی گزارتے۔ یعنی روسی معاشرہ عدم توازن کا شکار تھا۔ ایک ملک کے اکثر آبادی بھوکی تھی اور بھوک سے مری جارہی تھی۔ تو دوسری طرف ملکی وسائل پر قابض لوگ دن رات ان عوامی وسائل پر عیش وعشرت کی زندگی جی رہے ہیں۔ 1905ء میں جب جاپان سے روس کو شکست ہوئی تو زار شاہی حیران رہ گئی۔ اور ان کو اندازہ ہوا کہ دنیا سائنس وٹیکنالوجی کے لحاظ سے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ لیکن اس وقت کچھ نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ روس ان ممالک سے ترقی کی میدان میں دوسو سال پیچھے رہ گیا تھا۔ کچھ انقلاب پسندوں نے 1825ء میں غلامی کو ختم کرنے کیلئے تحریک چلائی لیکن اس تحریک کو کچل دیا گیا۔ سینکڑوں لوگ ہلاک کئے گئے اور سینکڑوں کو سائبریا بھیج دیا گیا۔ روس کی شاہی حکومت کو دوسرا جھٹکا تب لگا جب پہلی جنگ میں عظیم ٹائن برگ کے مقام پر روسی فوجیوں کو گھیر کر مار دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ ملک میں فولاد کے کارخانے نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے روسی فوجیوں کو بھاری اسلحے سے لیس کرنا ممکن نہ رہا۔ لینن نے اپنے ساتھیوں سے مل کر انقلاب برپا کیا اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے ملک کی کایا پلٹ دی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کمیونزم نے روس کو بہت کچھ دیا۔ کمیونزم کے زوال کے بعد آج اگر روس امریکہ کے آنکھوں میں آنکھیں ملا کر کھڑا ہے تو یہ صرف کمیونزم کے ثمرات ہی ہیں۔ کیونکہ جو کام صدیوں پر محیط تھا وہ سوشلسٹ انقلابیوں نے 30 یا چالیس سال تک کے مختصر عرصے میں کر کے دکھادیا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری اپنی کتاب لینن سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> سوویت وطن اپنے سائنس دانوں کے عظیم دریافتوں اور کارناموں پر بجا فخر کرتا ہے۔ سوویت سائنس دانوں اور سارے عوام کی نمایاں فتح دنیا میں پہلی بار تابع زمین اور تابع چاند سوویت مصنوعی سیاروں کی پرواز تھی۔ سوویت لوگوں نے پہلی بار کائناتی پرواز کی اور براہ راست فضا میں نکل کر نظر ڈالی۔ خود کار اسٹیشن سیارہ زہرہ کو بھیجا گیا۔ اور اس پر اتارا گیا کائناتی مشینوں کے خود کار استحصال نے ایک بار پھر ہمارے عوام کی مردانگی، جرائت اور عظیم جذبے کی اور سوشلسٹ ریاست کی سائنس اور ٹیکنیک کے اعلیٰ معیار کی تصدیق کی۔ (۲۷)

انقلاب کے فوراً بعد لینن نے اعلان کیا کہ ملک کے طول وعرض میں بجلی کا انتظام کیا جائے تو مشہور انگریز

دانشوار ایچ جی ویلز حیران تھا کہ لینن خیالی انسان ہے۔ ممکن نہیں ہے لیکن منصوبہ کا آغاز ہوا۔ اور ساتھ ساتھ فولاد کی بھاری صنعت کی طرف توجہ دی گئی۔ ملک کے طول وعرض میں بڑے بڑے کارخانے قائم کر دیئے گئے۔ محنت کشوں نے اپنے عزم وحوصلے کے ساتھ تمام مشکلات پر قابو پالیا۔ مزدور کسان جبر واستحصالی معاشرے سے آزاد ہو کر نئے جذبے سے سرشار ہو گئے۔ ان کے دن رات کی لگاتار محنت جدوجہد رنگ لائی۔ اور انقلاب کے صرف 40 سال بعد ملک کی صنعتی پیداوار میں 66% اضافہ ہوا۔ دھات کی صنعت میں 538 گنا بڑھ گئی۔ کیمیائی صنعت میں 294 گنا اضافہ ہوا فولاد کی 2205 گنا بڑھی۔ بجلی کی پیداوار 2017 گنا بڑھی، نقل وحمل کے وسائل 2301 گنا بڑھ گئے اور روس کئی صنعتوں میں امریکہ کے ہم پلہ ہو گیا اور کئی چیزوں میں تو آگے نکل گیا۔ روس نے امریکہ کے ایٹمی اجارہ داری کا خاتمہ کیا۔ اور پہلا آدمی خلا میں بھیجا۔ روس ایٹمی مزائلوں بین الابراعظمی مصنوعی سیاروں اور ایٹمی آبدوزوں میں امریکہ کے برابر ہو گیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے نکل گیا۔ 1940ء میں ایک کروڑ تراسی لاکھ ٹن فولاد پیدا کر دیا۔ تین کروڑ گیارہ لاکھ ٹن مٹی کا تیل نکالا۔ 57 لاکھ ٹن سیمنٹ بنایا۔ ایک لاکھ چون ہزار موٹر کاریں بنائی۔ اکتیس ہزار چھ سو ٹریکٹر بنائے۔ 1940ء میں بے پناہ جنگی نقصان کے باوجود ترقی جاری رہی حالانکہ ان جنگوں نے جرمنی کو کھنڈر بنایا۔ جاپان پہ ایٹم بم گرائے گئے۔ اس جنگ میں سویت یونین کے بھی کروڑوں لوگ مارے گئے۔ لیکن ان سخت ترین حالات میں بھی 1940 کے نسبت 1945 میں پانچ گنا زیادہ فولاد، آٹھ گنا زیادہ تیل، 13 گنا زیادہ سیمنٹ، 462 گنا زیادہ کاریں، 11 گنا زیادہ ٹریکٹر 16.5 گنا زیادہ برقی توانائی پیدا کی گئی۔ بجلی کے پیداوار میں روس اب بھی تمام ملکوں سے آگے ہے۔ صرف سائبریا جیسے پسماندہ علاقے میں 38 لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کر رہا ہے۔ جبکہ امریکہ کا گرانٹ کولی سٹیشن 20 لاکھ وولٹ کے لگ بھگ بجلی پیدا کرتا ہے۔

سویت روس میں ہر سال گیارہ لاکھ نئے گھر بنا کر بے گھر لوگوں کو دیئے جاتے تھے۔ دنیا بھر کے صنعتی پیداوار میں اشتراکی ممالک کا حصہ 38% فیصد تھا۔ اسمیں صرف روس کا حصہ 20% فیصد تھا۔ سائبریا اور کرغبا میں سینکڑوں کارخانے قائم کئے گئے۔ روس میں زراعت کا کام بھی مشینوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ قوم کا بچہ بچہ تعلیم سے آراستہ ہے۔ ترکمانستان، ازبکستان، تاجکستان جیسے علاقوں میں جہاں انقلاب سے پہلے لوگ جاہل اور ان پڑھ تھے اب سینکڑوں اعلی درس گاہیں اور یونیورسٹی اور تعلیمی ادارے کھل چکے تھے۔ بھیڑ بکریاں چرانے والے سائنس اور دوسرے علوم میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ زار شاہی دور میں سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلباء کی تعداد ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ تھی لیکن 66-1965 میں یہ تعداد بڑھ کر ساتھ کروڑ کو پہنچ گئی۔ 1968ء میں دنیا بھر میں روسی

سائنسدانوں کی تعداد ایک چوتھائی تھی اور پہلا آدمی بھی روس نے خلا میں بھیج دیا اور انہوں نے اپنے روس کی تکنیکی مہارت پر امریکہ سمیت دنیا بھر کے سائنسدان حیران رہ گئے۔ انہوں نے اپنے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نصاب کو دوبارہ مرتب کیا وہ کامیابیاں جس کے لئے ملکوں کو صدیاں لگتی ہیں سویت یونین نے محض پچاس سال کے عرصے میں حاصل کیں۔

سقوط سویت یونین کے اسباب

ایک وقت ایسا بھی تھا جب سویت روس ادب، فنون لطیفہ رقص، سائنس کے میدان امریکہ کے مدمقابل تھا اور اس کا شمار امریکہ کے بعد طاقتور ملکوں میں ہوتا تھا۔ سویت یونین جو کہ پندرہ جمہوریتوں پر مشتمل تھا اسکا بننا بیسویں صدی کا بڑا واقع تھا اور اس کا بکھرنا بھی اس سے بڑا حادثہ تھا جس نے اہل فکر و نظر کو ورطہ حیرت میں ڈالا کہ کس طرح اتنی بڑی ریاست راتوں رات ٹوٹ گئی۔ سویت یونین جس کے پاس زمین کا چھٹا حصہ اور اس میں سو قومیتوں کے لوگ رہتے تھے۔ اس بڑی ریاست کو زوال منچائل گوربا چوف کے دور میں آیا۔ جب اس نے اصلاحات کا اعلان کیا۔ ایک ایسی ریاست جس نے فاشسٹ ہٹلر کو شکست دی۔ اور دنیا بھر کے انقلابیوں کو فنڈنگ کیا کیوبا اور ویتنام کے انقلاب میں سویت یونین نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایک وقت تھا کہ پوری دنیا میں سویت روس ڈھنکا بج رہا تھا اور امریکہ کو سخت خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سویت انقلاب کے اثرات امریکہ کے دیواروں پر دستک نہ دے اس وجہ سے امریکہ نے پہلے دن سے ہی اس کو بدنام کرنے کے لئے کام شروع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سویت یونین کے زوال میں امریکہ اور یورپ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ دنیا بھر کے مذہبی تنظیموں کو اکٹھا کر دیا گیا۔ ان کو امریکہ اور مغربی ممالک نے اسلحہ اور فنڈ فراہم کیا۔ جس سے ان مذہبی تنظیموں نے سویت افواج کے خلاف گوریلا جنگ کی اور بالآخر سویت یونین کے افواج افغانستان سے جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس جنگ سے سویت یونین کو بھی بے پناہ نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ جس نے معشیت کو بری طرح متاثر کیا۔ دوسری طرف کچھ اندرونی تضادات بھی تھے جس نے ایک خلاء پیدا کر دیا۔ وہ وجوہات درج ذیل ہیں:

i۔ آمریت:

سویت یونین کا قیام 1917ء مین بالشویک انقلاب کے ذریعے ہوا تھا۔ اور زار نکولس دوم کو اقتدار سے ہٹایا اور روس کی سابقہ حیثیت ختم کر دی گئی۔ 1922ء میں لینن کی قیادت میں دور دراز کی ریاستوں کو سویت روس کا

حصہ بنا دیا گیا۔ جس کے سربراہ ولادی میر لینن تھے۔ سویت یونین ایک وسیع وعریض ریاست تھی جس پر قابو رکھنا ایک مشکل کام تھا۔ زار حکومت کو ختم کرنے کے بعد جب کمونسٹ انقلاب آیا تو لینن نے جمہوری ریاست بننے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ ہوا اور آمریت ہی قائم ہوئی جس میں اہم آمر جورف سٹالن تھے۔ کچھ وقت کے لئے پارلیمان بھی قائم میں لایا گیا جسے سپریموسویت کہا گیا لیکن سارے فیصلے ایک مختصر ٹولہ کرتی تھی۔ سویت یونین جس نے ذاتی جائیداد کا تصور ختم کیا اور تیز ترین کامیابیاں حاصل کی لیکن۔ سٹالن کے وقت سے ہی سیاست، معشیت اور ریاست پر پارٹی کا کنٹرول مضبوط ہوتا گیا۔ مخالفین کو سائبریا بھیجا جانے لگا۔ جہاں ان کو اذیتیں دی جانے لگیں مختلف دانشواروں پر پابندی لگ گئیں۔ دانشواروں کو ملک بدر کیا جانے لگا اور اظہار رائے پر سخت پابندیاں عائد کی گئیں۔

ii۔ سخت ترین نوکر شاہی:

آمریت اور مرکزی حکومت کی وجہ سے سویت یونین میں ایک بڑی بیوروکریسی بھی وجود میں آئی جس کا کنٹرول معاشرے کے ہر حصہ پر بڑھتا گیا۔ اور شہری سخت احتساب اور نگرانی سے تنگ ہو گئے۔ اظہار رائے اور تنقید پر بھی سخت پابندی تھی جس سے ملک میں بے چینی پھیلتی چلی گئی۔

iii۔ گورباچوف اور اس کے اصلاحات:

سویت یونین کے بکھرنے کے بہت سے وجوہات تھیں لیکن اس کی سب سے اہم وجہ خود گوربا چوف بھی تھا۔ وہ اس لئے اقتدار میں آیا تا کہ سویت یونین کو تبدیل کر سکے۔

۸۰ء کی دہائی کے دوران سیاسی سطح پر ایسے حالات بنائے گئے جس سے موقعہ پرستی کو مزید تقویت ملی۔ ۱۹۸۷ء میں منظور کیے گئے قانون کے ذریعے ردانقلاب کی کامیابی کا راستہ صاف کیا گیا۔ اس قانون کے ذریعے سوویت یونین میں ذاتی ملکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کی مختلف شکلوں اور معاشی رشتوں کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔

۹۰ء کی دہائی کی ابتداء میں منڈی کے منصوبے بند معیشت کے سوشل ڈیموکریٹک نقطہ نظر بڑی تیزی کے ساتھ پابند منڈی معیشت کے حق میں دستبرداری اختیار کر گئی۔ یہاں معاملہ پہنچ کر بھی رکنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نام نہاد منڈی کی معیشت سے بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ آخر کار ''آزاد منڈی کی معیشت'' نے غلبہ حاصل کیا۔ ان اصلاحات کے نفاذ کے دو عشروں بعد مسائل واضح طور پر شدت اختیار کر گئے تھے۔ سوشلسٹ تعمیر کی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ

جمود نے سر اٹھایا۔ صنعتی اداروں اور کارخانوں میں تکنیکی پسماندگی ایک حقیقت بن گئی۔ متعدد اشیائے کی منڈی میں کمی کی شکایات بڑھنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ منڈی کو کئی طرح کے دیگر مسائل کا بھی سامنا شروع ہو گیا۔ کیونکہ کارخانے خود ساختہ تیزی لانے کے لیے کبھی کچھ چیزوں سے دکانیں کچھا کھچ بھر دیتے تھے تو کبھی چیزوں کی پیداوار روک دیتے تھے۔

1985ء میں گورباچوف کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بنے تو معیشت کا حال بہت برا تھا۔ انھیں ایک محرک اور غیر فعال سیاسی ڈھانچہ ملا تھا۔ اس وجہ سے گورباچوف نے اصلاحات کے نام پہ چند غلطیاں کیں۔ جس میں ایک کم حکومتی کنٹرول کی پالیسی تھی وہ سمجھتا تھا کہ اس سے ریاست کو فائدہ ہوگا اور غیر ملکی سرمایہ کاری میں اضافہ ہوگا۔

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی ردانقلاب کے حمایتی کرداروں کو بروقت بے نقاب نہیں کر پائی۔ ۹۰ کی دہائی میں پارٹی کے اندر سرمایہ دار موقع پرست اور کمیونسٹ جمع تھے۔ یہی وہ وقت تھا کہ جب ردانقلاب نے اپنا فیصلہ کن حملہ کیا۔ اس دوران کمیونسٹ قوتیں اتنی مضبوط نہیں تھیں کہ ردانقلاب کو روک پاتیں۔ اب کے انہوں نے خود کو روسی محنت کش عوام کے متحدہ محاذ کے گرد جمع کیا۔ انہوں نے روسی صدر اور نائب صدر کے لیے امیدوار کھڑا کر دیا۔ کمیونسٹ تحریک کے اقدامات کے ذریعے انہوں نے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر میں کام کیا اور کوشش کی کہ گورباچوف کو ان کی کمیونزم مخالف سرگرمیوں کی پاداش میں پارٹی سے نکال کر باہر کر دیا جائے۔ لیکن اس مزاحمت کے باوجود انقلابی کمیونسٹوں کا ایسا ہراول جو نظریاتی و سیاسی طور پر واضح اور مستقل مزاج ہو جو طاقتور ہوتے جا رہے تھے، ردانقلاب کے خلاف محنت کش طبقے کے نظریاتی، سیاسی اور تنظیمی سطح پر قیادت کر سکے، بروقت تشکیل نہیں پا سکا۔ حتیٰ کہ اگر اس مزاحمتی عمل کو بالخصوص ۱۹۸۰ء کے عشرے میں روکا نہیں جاتا تو حکمران ان پارٹیوں کے اندر بھی اور عالمی کمیونسٹ انٹرنیشنل بنانے کی جس جدوجہد میں لگے تھے اس کے لیے حالات قدرے بہتر ہوتے تھے۔ وہ مزاحمت اس گہرے بحران پر قابو پانے کے لیے کم از کم مادی لوازمات ہی پورے کر جاتی۔

بعض مصنفین جو کمیونزم کے خلاف تھے ان پر سے پابندیاں ہٹائی جانے لگیں۔ ہر کسی کو کھلی چھوٹ دی گئی کہ حکومت کی پالیسیوں پر آزادانہ تبصرہ و تنقید کر سکے۔ رفتہ رفتہ جب حکومتی کنٹرول ہی ختم ہو گئی تو ملک میں خوراک کی قلت پیدا ہونے لگی۔ کمپنیوں نے من مانیاں شروع کیں اور حکومتی اجازت کے برعکس قیمتوں میں من مانا اضافہ کر دیا۔ اس صورت حال میں روزمرہ کی ضروریات کی اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنی لگیں۔ ان حالات میں

بالآخر گورباچوف نے استعفیٰ دے دیا۔ اور اگلے ہی دن اس دستاویز پر دستخط کر دیئے گئے جس کے مطابق سویت یونین کے تمام ریاستیں الگ الگ ہوگئیں۔ گوریاچوف کی ان اصلاحات نے سویت یونین میں ایک بحران پیدا کیا اور بالآخر سوویت یونین کا اختتام ہوگیا۔

حوالہ جات

۱۔ فریڈرک اینگلز، خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز، بک ہوم، لاہور ۲۰۱۷ء، ص ۱۶۸

۲۔ سبطِ حسن سید، موسی سے مارکس تک، سمیع پریس، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸-۱۷

۳۔ ایضاً، ص ۱۶-۱۵

۴۔ سجاد ظہیر سید، مارکسی فلسفہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۵۷

۵۔ ایضاً، ص ۵۸

۶۔ ایضاً، ص ۶۱

۷۔ انور سدید ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، غزالی بردارز ناظم آباد، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۶۸-۶۷

۸۔ یوسف خان رانا، اشتراکیت کے چند نظریاتی پہلو اور سماجی ارتقاء، سرخ پرچم پبلی کیشنز، (حیدر آباد) جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۴۲

۹۔ لیوہیو برمین، یورپ امیر کیسے بنا، مترجم و تلخیص عبداللہ ملک، ناشر نگار شات میان چمبر، لاہور، ص ۱۳۵-۱۳۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳۷-۱۳۶

۱۲۔ ایچ جی ویلز، مختصر تاریخ عالم، ترجمہ محمد عاصم بٹ، تخلیقات لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۳۹

۱۳۔ یوسف خان رانا، اشتراکیت کے چند نظریاتی پہلو اور سماجی ارتقا، ص ۶۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۷

۱۵۔ علی عباس جلالپوری، خرد نامہ جلالپوری، تخلیقات، لاہور، مئی ۱۹۳۳ء، ص ۶۵

۱۶۔ ایضاً،ص۷۶

۱۷۔ علی عباس جلالپوری،تاریخ کا نیا موڑ،تخلیقات،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۵۰

۱۸۔ سبطِ حسن سید، موسی سے مارکس تک،ص۸۔۷

۱۹۔ مارکس اینگلس، کمیونسٹ سماج،ترجمہ،امیر اثر خاں،فکشن ہاؤس لاہور،۲۰۱۷ء،ص۱۹

۲۰۔ ظ۔انصاری ڈاکٹر،لینن سوانح عمری،ناشر بک ہوم لاہور،۲۰۱۵ء،ص۵۴

۲۱۔ مارکس،اینگلس،لینن، کمیونسٹ سماج،ترجمہ،امیر اللہ خاں،ص۹۹

۲۲۔ ظ۔انصاری ڈاکٹر،لینن سوانح عمری،ص۱۳۰

۲۳۔ ایضاً،ص۱۳۱

۲۴۔ ایضاً،ص۱۳۶

۲۵۔ ایضاً،ص۱۳۴-۱۳۳

۲۶۔ ایضاً،ص۱۷۵-۱۷۴

۲۷۔ ایضاً،ص۱۸۱-۱۸۰

باب دوم

گمان اور اے غزالِ شب کا تعارفی مطالعہ

الف: ارشد وحید: حیات وخدمات

ناول اُردو ادب کی ایک مشہور صنف ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اُردو ادب میں ابھی بھی اچھے ناولوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ اُردو ادب میں ایسے ناول بھی ہیں جن پر ابھی تک قارئین اور ناقدین کی نظر نہیں پڑی یا ان پر قلم اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔

ارشد وحید کا نام ایسے ہی ناول نگاروں میں لیا جا سکتا ہے۔ بہت سے ادبی ذوق رکھنے والے ان کے تعارف سے ہی لاعلم ہیں۔ اس لیے راقم اس ناول نگار پر تحقیقی کام کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔

ارشد وحید ۲۳ ستمبر ۱۹۶۰ء کو بہاؤلپور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نشتر میڈیکل کالج ملتان سے آپ نے ایم بی بی ایس کیا۔ اس کے بعد آپ مزید تعلیم حاصل کرنے لندن چلا گیا جہاں سے ماسٹر ڈگری ''لندن سکول آف اکنامکس'' سے حاصل کی۔ لیکن تخلیقی قوت نے کو آرام سے نہ رہنے دیا اور جب تک اس کا اظہار ناول کی شکل میں نہیں آ گیا آرام سے نہ بیٹھے۔ اور اس طرح اُردو میں ایک اہم موضوع پر ناول گمان آ گیا جو ۱۹۸۰ء کے سیاسی سماج کو بیان کرتا ہے جس میں بائیں بازو کی تحریک موجود ہے۔

ادب کی دنیا میں ترجمہ نگاری کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور زندہ قومیں ہی ایسے کام کرتی ہیں جن سے اُن کی ترقی اور سوچ کو وسعت ملے اور کسی دوسرے ممالک کے لوگوں کی عادات، احساسات، خیالات، کلچر، تہذیب وتمدن کو جاننے کو موقع ملے۔ ایسے میں ترجمہ نگاری کی اہمیت اور بھی مسلّم ہو جاتی ہے۔ ترجمہ ایک فن ہے اور کوئی فن آسان نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے حسن الدین احمد لکھتے ہیں:

> ترجمہ ایک باقاعدہ اور مستقل فن ہے۔ اس کے اپنے مخصوص ضابطے ہوتے ہیں۔ ترجمہ کے فن میں مہارت اور قدرت پیدا کرنے کے نئے اور دوسرے ہنروں کی طرح شوق اور صلاحیت کے ساتھ تربیت اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترجمہ محنت طلب کام ہے۔ ایک طرف وہ سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس فن کے اصولوں سے واقفیت بھی لازم ہے۔ مختصر یہ کہ ترجمہ بڑی مشق اور خاص صلاحیتیں چاہتا ہے۔ (۱)

اُردو ادب میں محمد عمر میمن، آصف فرخی اور اجمل کمال، ظ انصاری، شاہد حمید اور محمد حسن عسکری نے بڑا نام کمایا

ہے۔ان ناموں میں ایک نام ارشد وحید کا بھی ہے ۔ارشد وحید نے ۱۹۹۵ء میں Gabriel Garcia Marquez کے مشہور ناول Love in The Time Of cholera کا ترجمہ وبا کے دنوں میں محبت کے نام سے کیا جو اکادمی ادبیات سے شائع ہوا۔اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ارشد وحید ترجمہ نگاری کے اصولوں سے مکمل واقفیت رکھتا ہے اور ترجمہ نگاری سے مکمل انصاف کیا ہے۔ارشد وحید نے اس کے بعد Milan Kundera کے ناول Immortality کا ترجمہ بقائے دوام کے عنوان سے کیا اور ادبی حلقوں میں ارشد وحید کی شناخت کا باعث بنا۔میلان کنڈیرا کی ایک اور کتاب Art Of Novel جو ناول کے فن سے تعلق رکھتی ہے کا ترجمہ بھی ارشد وحید کے قلم سے ہوا ہے۔کسی مصنف کی مسلسل تخلیقات کا منظر عام پر آنا اس کے مکمل مصنف ہونے کی دلیل ہے اور ارشد وحید اس بات کو کما حقہ پورا کر رہے ہیں۔

گمان کا تعارفی مطالعہ:

اُردو ناولوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات صاف عیاں ہے کہ اُردو میں ایسے ناول بھی کم نہیں جن کو ناقدین نے موضوع نہیں بنایا ہے جبکہ اپنے موضوعات کے حوالے سے یہ ناول بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ گمان ناول کا شمار بھی ایسے ہی ناولوں میں ہے۔یہ ناول 2011ء میں جمہوری پبلیکیشنز نے شائع کیا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں صرف پاپولر ناولوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کئی اچھے ناول قاری کی پہنچ سے ہمیشہ دور ہی رہتے ہیں یہ ناول اُس وقت ہی نظر میں آتے ہیں جب اتفاق سے کوئی مختصر سی تحریر یا اس حوالے سے ناول کا چند لائنوں میں کوئی تعارف لکھا ہوا مل جائے۔اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے شہزاد منظر اپنی کتاب پاکستان میں اُردو ادب کی صورتِ حال میں لکھتے ہیں:

> پاکستان میں اُردو ناول پر لکھتے ہوئے ایک قباحت ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ملک کے طول و عرض میں اُردو میں کون کون سے ناول شائع ہوئے۔جب تک موقر ادبی جرائد میں ان پر تبصرے شائع نہ ہوں یا سالانہ ادبی جائزوں میں اس کا ذکر نہ آئے۔جس کی وجہ سے بعض اچھے معیاری اور قابل ذکر ناول ناقدین اور قارئین کی توجہ سے محروم رہتے ہیں اور اہلِ ذوق طبقے کو اچھے ناولوں کی اشاعت کا علم تک نہیں ہوتا۔۔۔(۲)

گمان کو بھی اس حوالے سے کوئی اہمیت نہیں دی گئی حالانکہ ناول اپنے موضوعات اور فنی لوازمات کا حسن لیے

ہوئے ہے۔جس کی وجہ سے یہ ناول قاری کی توجہ سے محروم ہے۔کسی کتاب میں ارشد وحید کا تعارف بھی موجود نہیں ہے۔ مصنف اوراس ناول کا تعارف ڈاکٹر محمد اشرف کمال نے دولائنوں میں اپنی کتاب اُردو ناول۔ تاریخ و اِرتقا(آغاز سے اکیسویں صدی تک)ان الفاظ میں کراتے ہیں:''ارشد وحید۲۳ستمبر۱۹۶۰ءکو بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ان کا ناول گمان کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔انھوں نے مارکیز کے نال وبا کے دنوں میں محبت کا ترجمہ کیا۔''(۳)

یہ حقیقت ہے کہ ایک انسان کی تربیت میں ماں باپ کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ان ہستیوں کے بغیر علم کے زینے تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے اور گمان جیسا سیاسی،سماجی،تاریخی اور ترقی پسند ناول لکھنا اور مشکل کام ہے۔ ناول کے انتساب میں بھی یہ حقیقت کارفرما نظر آتی ہے۔مصنف نے ناول کا انتساب اپنے والدین کے نام کیا ہے۔

گمان کا موضوع مارکسی تصورات،پاکستانی سماج میں اس تحریک کا آغاز اور شکست،نظریاتی کشمکش،ایک مساوی اور مثالی معاشرے کا قیام،سرخ سویرا کا خواب،اور انیسویں صدی میں پاکستانی سماج میں بائیں بازو کی تحریک کی حقیقت پسندی کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔اس ناول میں مصنف نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۹ء کے پاکستانی سماج کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔گمان ۱۹۱۷ء میں روس میں رونما ہونے والے انقلاب کی ہی کڑی کا سلسلہ ہے۔ناول میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ تحریک درمیانی اور استحصالی نظام میں پسے ہوئے طبقے کی امنگوں کی تحریک تھی جو گھمبیر مسائل کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ان موضوعات کا اظہار ۱۹۷۰ء کے بعد شدت کے ساتھ ہوا ہے جن میں دنیا کے بدلتے حالات،نچلے طبقے کا استحصال،معاشی اقدار اور منافع بخش اداروں پر مخصوص طبقے کی اجارہ داری اہم ہیں۔انہی موضوعات کے حوالے سے ڈاکٹر منتظر مہدی اپنی کتاب ترقی پسند اردو ناول میں لکھتے ہیں:

> ۱۹۷۰ء آتے آتے انسانی زندگی کی ضروریات ومطالبات میں کچھ اس قدر اضافہ ہوا کہ اس کے سبب کچھ نئے موضوعات مثلاً بڑھتی ہوئی آبادی۔۔۔علاقائیت،دہشت گردی،سیاسی استحصال،ذرائع معاش کی وسیع ہوتی ہوئی دنیا تعلیم اور تعلیمی اداروں پر مفاد پرست عناصر کا قبضہ اور صارفی عناصر کا اور سیاست پر غلبہ وغیرہ نے ہمارے ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ان مسائل کی سنگینی کے اظہار کے لیے کسی ایسی صنف کی ضرورت تھی جو تفصیل،تسلسل اور

وضاحت کے ساتھ ان مسائل کی تمام جہتوں کا احاطہ کر سکے۔ ہمارے ادب کی تمام اصناف میں ناول ہی ایک ایسی صنف تھی جس میں واقعات اور کرداروں کی آویزش کے ذریعے تمام موضوعات کو سمیٹا جا سکتا تھا لہٰذا ۱۹۷۰ء کے بعد کے تمام ناول نگاروں نے فنی بصیرت کے ساتھ ان تمام موضوعات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ (۵)

گمان کا آغاز کبیر کے کردار سے شروع ہوتا ہے جو دن رات بے مقصد سنسان گلیوں اور سڑکوں پر آوارہ پھرتا ہے۔ اس کے ذہن میں ہر وقت کوئی نہ کوئی کہانی چل رہی ہوتی ہے لیکن اس کے ذہن کی کہانی کے کردار کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچ پاتے۔ اس کردار کی ذہنی حالت کے بارے میں اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

گلی خاموش اور سنسان تھی۔ اب کہاں جاؤں، اس نے سوچا، اور پھر اپنی سوچوں میں گم اس گلی کے آس پاس پھرنا شروع کر دیا جو اس کے گھر کے قریب سے گزرتی تھی۔ سارا دن وہ مختلف جگہوں پر بے مقصد پھرتا رہا تھا، مگر مدرسے اور گھر کے بیچ اب کوئی ایسی جگہ باقی نہ رہ گئی تھی جہاں وہ ٹھہر سکتا۔ (۶)

ناول کا ایک پہلو ۱۹۶۰ء کے دور سے تعلق رکھتا ہے جب ہر جگہ صدر ایوب کے خلاف جلسے اور جلوس شروع ہو گئے تھے۔ یہ دور ملک میں تبدیلیوں کا دور تھا۔ لیکن حالات اُس وقت زیادہ خراب ہو گئے جب صدر ایوب نے ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت خارجہ سے الگ کر دیا۔ بھٹو کی سیاسی کرشماتی شخصیت نے صدر ایوب کے خلاف ایسی ملک گیر تحریک شروع کی جس کی تاب صدر ایوب نہ لا سکے۔ اس کا تذکرہ ناول میں بڑے ہی دلکش انداز میں کیا گیا ہے:

ماسٹر جان محمد نے کچھ کہنا چاہا، مگر اس کے منہ کھولنے سے پہلے ہی لڑکے بستے اٹھا کر کلاس سے نکل کر باقی جلوس کے ساتھ مل کر دوسری کلاسوں میں چھٹی کروانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب باہر سڑک پر تھے۔ ان کا جلوس مرکزی چوک کی طرف بڑھنے لگا۔ کالج کے لڑکے سب سے آگے آگے تھے اور وہ ملک کے فیلڈ مارشل صدر ایوب کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے دیکھا دیکھی سکول کے لڑکے بھی ان کے نعروں کا جواب دینے لگے۔۔۔ (۷)

اس کے بعد ناول میں ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ جب اس جنگ کا آغاز ہوا تو

بہت سے کردار شہری دفاع کی تنظیم میں شمولیت کر لیتے ہیں۔کبیر اور محلے کا ایک آوارہ لڑکا بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔اوران میں سے ہر کردار اپنے آپ کو کسی عظیم جرنیل سے کم نہ سمجھتا تھا۔ان کو یقین تھا کہ پاک فوج کسی صورت میں یہ جنگ نہیں ہار سکتی۔اس لیے ان کو غیر ملکی ریڈیو کی خبروں پر بھی یقین نہیں آتا تھا، جب اس جنگ کے آخر میں پاک فوج کو ہتھیار ڈالنے پڑے تو اس کو بھی غیر ملکی پروپیگنڈہ سمجھا گیا۔اس صورتِ حال کو ناول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

---جنگ کے آخری دنوں میں جب غیر ملکی ریڈیو سے اس نے پسپائی کی خبریں سنی تو پھر بھی اس کا یقین متزلزل نہ ہوا۔اس کے خیال میں ایسی خبروں کے پس پردہ دو محرکات تھے۔ایک تو یہ کہ عالمی ذرائع ابلاغ ان کے خلاف سرگرم تھے۔دوسرے یہ کہ یہ ان کے افوج کی حکمت عملی کا حصّہ تھا کہ دشمن کو آگے بڑھنے دو اور پھر گھیرے میں رہ کر اس کا صفایا کر دو۔مگر جس روز ان کے اپنے ریڈیو نے ہتھیار ڈالنے کی خبر سنائی، تو اس کے منہ سے دیر تک کوئی لفظ نہ نکلا۔انہیں پتا بھی نہ چلا کہ کب وہ شہری دفاع کے دفتر سے اٹھ کر کہیں غائب ہو گیا۔ (۸)

ناول میں ۱۹۷۰ء کے انتخابات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔یہ انتخابات پاکستانی تاریخ کا حصّہ بن چکے ہیں۔یہ اس ملک کے پہلی بار جمہوری انتخابات تھے جس کی وجہ سے آنے والی نئی حکومت سے عوام کو بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ارشد وحید نے اس دور کے واقعات کی صورت گری یوں کی ہے:

یہ ملک میں تبدیلیوں کا دور تھا۔۱۹۷۰ء کی دہائی کا درمیانی عرصہ تھا پہلی بار جمہوری انتخابات کے بعد ملک میں نئی حکومت آئے تین چار سال ہو چکے تھے۔زندگی ہر سطح پر کروٹ بدل رہی تھی۔بہت سے حادثات جو لوگوں کے تصورات سے بہت اجنبی تھے، رونما ہو چکے تھے۔ابھی لوگ اس سے سنبھل نہ پائے تھے، کہ ایک بالکل ہی مختلف نسل، اپنے نئے خوابوں کے ساتھ متحرک ہو چکی تھی۔ان کے پاس گئے دنوں پر ماتم کرنے کی فرصت تھی اور نہ ہی خواہش۔اس کے برعکس بہت سی باتیں جو ان کے تصورات سے نئی نئی آشنا ہوئی تھیں مگر گرفت سے دور ہی محسوس ہوتی تھی، اب نزدیک آتی دکھائی دے رہی تھیں۔کبیر کو یہ سب نیا اور دلچسپ لگتا تھا۔ان کے گھر کے قریب ہی چائے کا کھوکھا تھا جو گزشتہ انتخابات میں ایک

پارٹی کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔۔۔ (۹)

گمان کا بڑا حصّہ مارکسی تصورات، بائیں بازو کی تحریک، اور پاکستانی سماج کی تاریخ کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول اگر قیامِ پاکستان سے قبل منظرِ عام پر آتا تو اس کو ترقی پسند ناول ہی قرار دیا جاتا جس نے کمیونزم کے بطن سے ہی جنم لیا تھا۔ مارکسی فلسفے میں جدلی اور تاریخی مادیت کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس فلسفے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ صنعتی انقلاب کس طرح برپا ہوا اور اس کے بعد کس طرح طبقاتی تقسیم وجود میں آئی اور ایک مساوی اور مثالی معاشرہ کس طرح وجود میں آسکتا ہے۔ اس تحریک کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب اردو ادب کی تحریکیں میں لکھتے ہیں:

> کارل مارکس کے مطابق خارجی دنیا اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے۔ اور داخلی فکر و خیال سے آزاد ہے چنانچہ شعور مادے کو جنم نہیں دیتا بلکہ مخصوص حالات میں مادہ ہی شعور کی تخلیق کرتا ہے۔ یوں مارکس نے معاشیات کے حوالے سے جدلیات کا مادی تصور مرتب کیا اور مادی تضاد کو اصل حقیقت اور ان کی آویزش کو نئے معاشرے کی تخلیق کی اساس قرار دیا اور یوں مادہ اور مادہ کو پیدا کرنے والے ذرائع کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگئی۔ مادے کے ذرائع پیدا وار اور تقسیم چونکہ مساوی نہیں اس لئے انسانی معاشرہ طبقات میں منقسم ہے اور ہر طبقہ کشمکش کے ایک مسلسل عمل سے گزر رہا ہے۔ مارکس کے خیال میں مثالی معاشرہ اس وقت ظہور میں آئے گا جب آجر اور اجیر کی اقتصادی آویزش ختم ہو جائے گی اور یوں ایک غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آئے گا۔ مارکس نے اس مثالی معاشرے کو اشتراکی سماج کا نام دیا ہے۔ (۱۰)

گمان میں کبیر، مرتضٰی، کمال، جبار، فہمیدہ، عفت، ظفر سلیم، محمد علی اور شہریار کا تعلق بائیں بازو کی تحریک سے ہے۔ ان کرداروں نے مختلف گاؤں اور شہروں میں سٹڈی سرکل بنا رکھے ہیں جہاں یہ لوگ اپنے مارکسی تصورات کا پرچار کرتے ہیں اور اپنی اس تنظیم کو منظّم کرنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ان کرداروں کی خواہش ہے کی ملک میں نئے نظام کا ظہور ہو اور اس طرح ایک مساوی اور مثالی معاشرہ وجود میں آئے۔ لیکن جیسے ہی یہ لوگ اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہیں پولیس والے ان کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں اس طرح ان کے بہت سے ساتھی گرفتار ہو کر پابند سلاسل ہو جاتے ہیں۔ لیکن سالوں بعد جب یہ لوگ جیلوں کی ہوا کھا کر باہر آتے ہیں تو دوبارہ اپنی سر

گرمیوں کا آغاز کر دیتے ہیں۔اس کا اظہار ناول میں خوبصورت پیرائے میں اس طرح کیا گیا ہے:

> ہماری بہت سی میٹنگیں ہوئیں۔اب حالات میں کچھ بہتری ہے۔ ہمارے کافی لوگ باہر آ گئے ہیں۔ہم نے تمام صورت حال کا از سر نو جائزہ لیا۔ پاکستانی معاشرے کی معاشی اور سماجی ساخت کا جائزہ لیا۔طریق پیداوار کے بارے میں ہماری بحثیں ہوئیں۔ پھر ہم نے اپنی کانگریس کی۔اس میں طے ہوا کہ پاکستان میں سرمایہ دارانہ نظام حاوی ہے۔جبکہ جاگیردارانہ اقدار اس کی سماجی ساخت کا حصّہ ہے۔ہم نے طے کیا کہ پاکستان میں قومیتی مسئلہ غیر اہم نہیں بلکہ اس میں بہت پیچیدگیاں ہیں اور قومیتی استحصال پوری طرح موجود ہے۔دنیا کے ترقی یافتہ ممالک تیسری دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح پاکستان کو بھی لوٹ کھسوٹ اور سیاسی عدم استحکام کا شکار کئے ہوئے ہیں۔دوسری طرف پاکستان میں ایک طرف پنجاب ہے کراچی کی ترقی یافتہ آبادی ہے اور بچھڑی ہوئی دوسری قومیتیں ہیں جو دوہرے استحصال کا شکار ہیں۔(۱۱)

اس میں شک نہیں کہ مارکسی تصورات میں زیادہ اہم عنصر ذرائع پیداوار ہوتے ہیں لیکن اس میں صرف یہی بات کافی نہیں ہے بلکہ اس میں یہ بھی دیکھا جانا ضروری ہے کہ اس تاریخ میں طبقات کس طرح اہم کردار ادا کرتے ہیں اور کس طرح یہ عناصر تاریخ کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اس کو ہم کسی بھی معاشرے کی ایک مفاداتی جنگ بھی کہہ سکتے ہے۔مارکسی نظریات کسی ایک دن کی کاوش نہیں بلکہ اس نظریات کے پیچھے ایک پورا عمل اور تسلسل ہے جس نے اس تحریک کو جنم دیا۔یہی وجہ ہے کہ اس تحریک نے ہر ملک کے لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔اس تحریک نے لوگوں کے ذہن پر ایک نشے کا سا اثر کیا۔اس تحریک کے ضابطہ حیات کے بارے میں ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب تاریخ کے بدلتے نظریات میں لکھتے ہیں:

> مارکسی نقطہ نظر سے تاریخی عمل میں ذرائع پیداوار، پیداواری تعلقات اور طبقاتی کشمکش اہم کردار ادا کرتے ہیں۔جب اس نقطہ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کیا گیا تو اس نے تاریخی مفہوم کو ایک نئی جہت دی۔اس نقطہ نظر کے تحت یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ نظریات و افکار کی تخلیق میں کن طبقاتی مفادات کا کردار ہوتا ہے۔مختلف تحریکیں کن حالات کے تحت پیدا ہوئیں؟ اور ان کا

فائدہ کن کو ہوا؟ زمانہ غلامی میں کون سے قوانین بن رہے تھے؟ اور زمانہ جاگیرداری کی ثقافت کن عناصر سے تشکیل پا رہی تھی؟ اس کی مدد سے معاشرہ کی سیاسی و سماجی تاریخ کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ (۱۲)

کسی بھی عمدہ ناول کے لیے پلاٹ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پلاٹ میں واقعات کی ترتیب جتنی اچھی ہوگی وہ ناول بھی اتنا ہی لطف دے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پلاٹ میں کہیں بھی کسی قسم کا جھول نہ ہو۔ پلاٹ کی تعریف کرتے ہوئے اسلم آزاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

ناول کے پلاٹ کی تشکیل کا فن، تعمیر کے فن کے مترادف ہے۔ اچھے پلاٹ کے لیے تکنیکی ہنرمندی کی ضرورت ہے۔ جس طرح معمار، عمارت کو خوبصورت بنانے کے لیے اس کے مختلف حصّوں کو سلیقے اور خوش اسلوبی سے ملاتا اور جوڑتا ہے۔ اس طرح ناول نگار، ناول کے پلاٹ کے مختلف اجزاء کو خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ پلاٹ کے یہ اجزا جتنی احتیاط سے فطری طور پر مربوط ہوتے ہیں۔ پلاٹ اتنا ہی مکمل، موثر، اور دلکش ہوتا ہے۔ (۱۳)

گمان کا پلاٹ پاکستانی سماج کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس کے واقعات اور کرداروں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اگر ہم ان کرداروں کی باتوں کا تجزیہ کریں تو گمان کے پلاٹ کی خوبی اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ایک اچھے پلاٹ میں یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ یہ اپنے ابتدا سے ہی دلکش ہوتا ہے۔ گمان کا آغاز دیکھا جائے تو یہ خوبی قاری پر عیاں ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص رات کے وقت ایک مسجد کے سامنے اداس بیٹھا ہے۔ ناول کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے:

''یہاں پر سویا نہیں جا سکتا۔ رات کافی ہو گئی ہے۔ اب تم جاؤ'' مسجد کے امام نے کبیر کے قریب آ کر اسے کہا۔ وہ چونک گیا۔ وہ بہت دیر سے مسجد کی منڈیر پر جلتے ہوئے چراغوں کے پاس بیٹھا تھا۔ منڈیر کے نیچے، گلی میں مسجد کے ساتھ کی دکانیں کب کی بند ہو چکی تھیں، اور مٹی کے تیل سے جلتے ان چراغوں کی روشنی سے پڑے اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ امام کی طرف بغیر دیکھے اٹھا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر کر، مسجد کے دروازے تک آیا، کچھ

دیر اس کی دہلیز پر کھڑا رہا اور پھر باہر نکل گیا۔(۱۴)

گمان کا پلاٹ عمدہ ہے کیونکہ اس میں جتنے بھی واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ ہماری سیاسی سماجی تاریخ کا ماضی ہے جن کا سامنا اپنے زمانے کے لوگوں نے کیا ہے۔

ناول میں کردار نگاری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قصے میں عمل کی ساری صورت حال کو کرداروں کے ذریعے ہی کی جاتی ہے۔قاری کسی اہم بات یا واقعات سے کرداروں کے ذریعے ہی آگاہ ہوتا ہے۔اس لحاظ سے کردار نگاری ایک اہم فنی محاسن ہے۔

گمان ناول میں کرداروں کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔اس ناول کے زیادہ تر کردار مارکسی تصورات کے حامل کردار ہیں جو پاکستانی سماج میں نامساعی حالات اور مشکلات کے باوجود بھی سرخ سویرا کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ان سب کرداروں کی ایک ہی خواہش ہے کے پاکستان میں سے جاگیرداری نظام کو اکھاڑ پھینکیں اور اس کی جگہ ایک مثالی معاشرے قیام کیا جائے۔اسی کوشش میں یہ تمام کردار مصروف عمل ہیں۔

گمان کا پہلا کردار جس سے ہم ناول کے شروع میں ہی متعارف ہوتے ہیں کبیر ہے جو راتوں کو بے مقصد آوارہ سڑکوں پر گھومتا ہے۔وہ اکثر مسجد کی منڈیر پر گھنٹوں کسی سوچ میں گم صم بیٹھا رہتا ہے۔شاید یہاں پر مصنف نے ۱۹۶۰ء کے دور میں لوگوں کی بے چینی اور نفسیاتی الجھنوں کو اس کردار کے ذریعے بیان کیا ہے۔کبیر اپنی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے سکول سے حاصل کرتا ہے بچپن کی ان یادوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> بہت سے بہن بھائیوں اور رشتے داروں کے بچوں میں گھرے ہوئے اس کے شب و روز ایسے ہی گزرے تھے۔چہرے کے قریب جمع مکھیوں کی یورش سے وہ صبح ہڑبڑا کر اٹھتا اور رات کی بچی روٹی جسے پانی میں بگھو کر اور گھی لگا کر گرم کیا جاتا، کے الٹے سیدھے نوالے چائے کے ساتھ حلق سے اتار کر انہی کپڑوں میں سوئے سوئے اس خاک آلود پرائمری سکول کی طرف روانہ ہو جاتا، جس میں موسم اور دھوپ کے حساب سے ہر روز ان کی کلاس کسی نئے مقام پر لگتی۔کبھی چھت کے نیچے، کبھی درخت کے نیچے، کبھی ٹاٹ پر تو کبھی ان بوریوں پر جو انہوں نے گھروں سے لے جا کر سکول میں رکھ دیں تھیں تا کہ جب کسی ایسی جگہ بیٹھنا ہو جہاں پر پہلے سے ٹاٹ نہیں تھا، تو ان بوریوں کو استعمال کیا جا سکے۔شام کو

سارے بچے مل کر، گھر کے کسی کونے میں چھپ کر، چاند یا بت کھیلتے، جو اس وقت ان کی واحد تفریح تھی اور جس میں وہ کبھی ناغہ نہیں کرتا تھا۔(۱۵)

سہ پہر کو کبیر حکیم شمس الدین کے مطب میں قرآن پڑھنے جاتا جہاں پر اکثر ان کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا۔ دجال کے قصے بھی کبیر نے یہاں پر ہی سنے تھے اس کے علاوہ جنت اور دوزخ کے بارے میں یہاں ہی آ کر معلوم ہوا۔قبل از قیامت کے آثار بھی ان کو مطب میں پڑھنے کے دوران ہی پتا چلے۔ان خیالات سے ان کے ذہن میں نئی کہانیاں پیدا ہونی شروع ہوئی۔وہ کبھی اس نتیجے پر نہ پہنچ سکا کہ حقیقی جہاں کون سا ہے، وہ جس کی طرف ہر وقت اس کا خیال لگا رہتا ہے یا یہ جو اس کے اردگرد موجود ہے۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں کبیر شہری دفاعی تنظیم میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے اور بلیک آؤٹ کی نگرانی کرتا ہے۔کبیر خیال کرتا ہے کہ ہم نے جتنے بھی آدرشی نظریات اور نظامِ حکومت قائم کر لیے ہیں ان کی کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں یہ سب نظام کسی حادثاتی طور پر ظہور پذیر ہوئے ہیں اور ایک دن ہم اس جہاں سے چلے جاتے ہیں سب کچھ ادھر ہی رہ جاتا ہے کوئی شے بھی ہماری نہیں ہے۔ان کے خیالات کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> یہ جو اتنے عظیم آدرش ہم نے تخلیق کیے ہوئے ہیں۔یہ اتنا پھیلا ہوا اخلاقی نظام، تاریخ، اس سادہ سی حقیقت کے سامنے کس قدر مضحکہ خیز ہیں۔ہم، جو سب، یہاں کسی بات کے دوام کے دعویدار نہیں ہیں، اچانک، ایک حادثے کے ردعمل کے نتیجے میں یہاں آئے ہیں اور ایسے ہی چلے جائیں گے، کوئی شے ہماری نہیں ہے، تو ہم کس بات پر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔(۱۶)

کبیر لاہور انجینئرنگ سے تعلیم حاصل کرتا ہے اس زمانے میں وہ غیر محسوس طور پر مذہب سے دور ہو جاتا ہے۔اس کی اب سیاست سے بھی کوئی زیادہ دلچسپی نہ رہی تھی یہ وہ دور تھا جب ملک میں مارشل لاء کے مخالف آوازیں اٹھنا شروع ہو رہی تھیں۔لیکن ان کے ذہن میں ہر وقت خیالات کا تضاد قائم رہتا ہے وہ کبھی بھی کسی نظریات پر مستحکم نہ ہو سکا۔ہر وقت ان کے ذہن میں کوئی نہ کوئی الجھن موجود رہتی ہے وہ کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا۔اپنے گھر کے ماحول سے بھی وہ اکتایا ہوا ہے۔ان کی آرزو کے مطابق کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔اس کی الجھن کی عکاسی ان الفاظ سے بخوبی ہو جاتی ہے:

مختلف تصورات اس کے خیالات کی لڑی تھامے اسے اجنبی خیالات میں لے جاتے تھے۔اس کے سامنے کا موجودہ منظر غائب ہو جاتا ہے اور اس کی اپنی دنیا شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے کی طرح اب بھی اس خواب میں واقعے کی انتہا پر اس کی بے قراری بڑھ جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ منظر بدل جائے۔وہ ہر کہانی کا مرکزی کردار ہوتا اور عین انتہا پر اپنے رول سے اکتا جاتا۔اس سمجھ نہ آتا کہ وہ اپنے کردار کو کس طرح بدلے۔اس کردار کو وہ مارنا چاہتا نہ تھا اور مارے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔اس پریشانی میں کوئی دوسرا خواب اس کی جگہ لے لیتا اور وہ ایک نئے سلسلے میں مصروف ہو جاتا۔وقت کے ساتھ ساتھ اس کے تصورات بدلتے گئے۔سکول سے کالج تک اس پر سے بہت سے تغیرات گزرے۔مگر اب تک وہ پورے یقین کے ساتھ خود کو کسی سیاسی نظریئے سے وابستہ نہیں کر سکا تھا۔اس کو لگتا تھا کہ ان میں وہ مل نہیں سکتا تھا جو وہ چاہتا تھا۔کچھ ہے جو ان میں نہیں ہے۔ان سے مختلف ہے۔(۱۷)

لیکن ان کو آزادی کے کسی کامل نظریے پر یقین نہ تھا کہ آزادی کے کسی کامل نظریے کے ساتھ رہ سکیں گے کیونکہ وہ تو ایک شہر میں رہتا تھا جہاں آزادی ایک ممنوعہ شے تھی۔اس کے بعد ان کی ملاقات آزاد سے ہوتی ہے جو ان کو مارکسی سیاست سے آگاہ کرتا ہے کہ کمیونسٹ تنظیم میں تمام زندگی کو مارکسی اصولوں پر ہی استوار کرنا پڑتی ہے۔اس کے ساتھ ہی کبیر کو جیل کی ہوا بھی کھانا پڑتی ہے جہاں پر اس کی ملاقات اور طالب علموں سے ہوتی ہے۔ لیکن جیل سے باہر آ کر کبیر کو عفت سے عشق ہوتا ہے لیکن عفت مرتضٰی کو پسند کرتی ہے۔اس کے بعد کبیر کو رات کے وقت اکیلے پھرنے پر پولیس والے اسے پکڑ لیتے ہیں۔ان کے بار بار پوچھنے پر بھی کبیر ان کو اپنا نام نہیں بتاتا اور پولیس کے منہ پر تھوکنے پر ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

دوسرا کردار کبیر کے باپ دین محمد کا ہے جو ڈپٹی کمشنر کے آفس میں کلرک ہے۔اس کا والد نوآبادیاتی عہد میں بھی انگریز سرکار کا ملازم تھا۔کبیر کے باپ کو ہمیشہ سرکاری نوکری پر فخر رہا اور حکومت کے ساتھ وفاداری اس کی شخصیت کا ایک روشن پہلو رہا ہے۔جب ملک میں بے چینی کا آغاز ہوا تو اس وقت بھی اس کا باپ یہ دیکھنے گھر آتا ہے کہ ان کے گھر میں سے تو کسی نے حکومت کے خلاف مظاہروں میں حصہ نہیں لیا،اور اپنے بیٹوں کے گھر میں ہی رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔کبیر کے باپ دین محمد کے خیالات کی عکاسی ان باتوں سے ہوتی ہے:

۔۔۔کبیر کا باپ دین محمد کی اس دلچسپی کا اظہار کچھ زیادہ متشددانداز میں ہوتا تھا۔اس کے گھر ،اس کی چھوٹی سی سلطنت، میں اس نے ہر شخص کو کو اپنے دیئے ہوئے تحفظ اور خوف کی لڑی میں پرویا ہوا تھا۔توحید اور کبیر اس کے لیے مستقبل کے مکمل انسان تھے،جنہوں نے نہ صرف اس مملکت خداداد میں اس کے لئے عزت وتوقیر کا باعث بننا تھا بلکہ اس گم گشتہ عظمت اور حکمرانی کو،جس کو وہ چھوڑ آئے تھے، کے دوبارہ حصول،جس وطن سے مہاجر بن کر آئے تھے ،اس میں دوبارہ فاتحانہ شکوہ کے ساتھ واپسی کے اس خواب کی تکمیل بھی کرنا تھی۔اس لئے وہ ان کی تربیت پر بے انتہا پریشانی صرف کرتا تھا۔''مخزن الاخلاق'' جیسی کتابوں میں لکھے اصولوں کی روشنی میں وہ ان نئے انسانوں کی تعمیر کرتا رہتا۔(۱۸)

دین محمد ایک محبّ وطن کردار ہے۔ان کا ہر فیصلہ نیک نیتی پر مبنی ہوتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے لوگ اس سے خود بخود محبت کرنے لگتے ہیں۔

ایک اور مارکسی کردار جبار کا ہے جس کو اپنے مقصد سے سچی لگن ہے، جو ہر وقت ایک نئے نظام کو نافذ کرنے کی دھن میں گم صم ہے کسی جگہ پر اکیلا ہو تب بھی ان کی حرکات وسکنات سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی سے باتیں کر رہا ہے۔صدر ایوب کے خلاف جلسے میں اس کی سرگرمی کو کبیر یوں بیان کرتا ہے:

مرکزی چوک پر پہنچ کر جلوس رک گیا۔کچھ لڑکے ایک اونچی دکان کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں کھڑے ہو کر نعرے لگوانے لگے۔کبیر نے دیکھا کہ دو ٹرکوں پر سوار پولیس نے جلوس سے کچھ فاصلے پر پوزیشنیں سنبھالنا شروع کر دیں۔پولیس کو دیکھ کر لڑکوں میں جوش وخروش بڑھ گیا۔لگتا تھا جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔کبیر نے دیکھا اس دوران جبار اس اونچی چھت پر چڑھ چکا تھا،اور اس نے تقریر شروع کر دی تھی۔سرخی مائل،سفید رنگت،اور گنگھریالے بالوں والے اس دراز قد نوجوان کو کبیر جانتا تھا۔وہ کمہاروں والی گلی سے پرے، بلاک نمبر 6 میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔کبیر کے سکول کے سامنے ایک بڑا سا خالی میدان تھا،جس کے آگے کالج کی عمارت شروع ہوتی تھی۔وہ اکثر جبار کو اس میدان سے گزرتے دیکھتا تھا۔اسے یوں لگتا جیسے وہ ہر وقت کسی سے باتیں کر رہا ہے اور کوئی اسے

سن کر اسے جواب بھی دے رہا ہے۔اس کے چہرے پر یا مسکراہٹ ہوتی یا کسی گہری تکلیف
کا احساس، کہ جیسے وہ ابھی رو دے گا۔ چلتے ہوئے ہوا میں یوں ہاتھ چلا رہا ہوتا جیسے کسی کو
اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ (۱۹)

وہ صدر ایوب کے خلاف ایک جلسے میں تقریر کرتا ہے اور اس کے بعد گھر نہیں آتا اور اپنے آپ کو انڈر گراؤنڈ کر لیتا ہے۔ پولیس ہر وقت ان کے گھر کے باہر پہرا دیتی ہے کہ کب وہ گھر آئے اور اس کو گرفتار کیا جائے سکے۔ جبکہ ان کی ماں اس بات سے پریشان ہے اور وہ اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے اپنے محلے میں کھیر بھی تقسیم کرتی ہے۔ اس کے بعد یہ کردار ناول سے کافی عرصے کے لیے غائب ہو جاتا ہے اور بعد میں کبیر سے پتا چلتا ہے کہ وہ تو اٹک جیل میں ہے۔ جس پر پولیس نے بدترین تشدد کیا ہے۔ کبیر کی ملاقات جبار سے جیل میں ہوتی ہے۔ ناول کے آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو طبیعت خراب ہونے پر ہسپتال میں داخل کیا جاتا ہے۔

گمان کا ایک اور مارکسی کردار مرتضٰی ہے کبیر نے مرتضٰی کو ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے وقت سارا دن اپنے گھر کے پاس ایک کھوکھا میں بیٹھا انتخابات کے نتائج سنتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن انتخابات کے بعد مرتضٰی بہت کم ہی وہاں آتا کیونکہ ان کو حکومت سے اپنی توقعات کا یقین نہ رہا تھا اس وجہ سے اس کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہو گیا۔ مرتضٰی کا باپ ایک تحصیلدار تھا جس نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک مسجد بنوائی اور اس مسجد میں امامت شروع کر دی۔ ان کی وفات کے بعد کئی دکانیں مرتضٰی کو ترکے میں ملیں جس کی وجہ سے ان کے رہن سہن میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

مرتضٰی سب سے اہم مارکسی کردار ہے ان کے گھر پر بہت سی مارکسی تصورات پر مبنی کتب موجود ہیں، جن سے اکثر ان کے دوسرے ساتھی بھی مستفید ہوتے ہیں۔ ان کے گھر میں زرد اور سرخ پس منظر کے پوسٹر لگے ہیں جن میں زنجیروں اور کسرتی بدن والے اور آسمانوں کی طرف انگلی اٹھائے انسانوں کی تصویریں ہیں۔ ان کے گھر میں کارل مارکس، اینگلز، لینن اور چے گویرا کی بھی تصویریں اور پوسٹر موجود ہیں جن سے ان کا مارکسی ہونے اور مارکسی تصورات سے ان کی محبت اور لگن کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے گھر میں اکثر دوسرے مارکسی کرداروں کا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ وہ بہت جلد کوئی بڑی تبدیلی چاہتا ہے۔ اس لیے اکثر وہ اپنے ساتھیوں پر بھی تنقید کرتے ہوئے کہتا:

تم صرف حکومت بدلنا چاہتے ہو۔ لوگ نہیں۔ تم لوگ اسی طرح رہنا چاہتا ہو، جس طرح باقی

لوگ۔ ہمارے رشتے وہی پرانے ہیں۔ہم نے اپنے لئے سماجی کردار منتخب کیے ہوئے ہیں اورانہی کونبھائے جارہے ہیں۔ایک دوسرے کا جوتصور ہمیں سماج نے دیا ہے،ہم اسی عینک سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ایک دوسرے کو یاد کراتے ہیں کہ تمہیں اب یہ کرنے ہے اور یہ نہیں کرنا ہے۔معیار وہی ہوتے ہیں جو ہمیشہ سے چلے آرہے ہیں۔مرتضٰی نے اپنی بات جاری رکھی۔(۲۰)

مرتضٰی نے دوسرے گاؤں اور شہروں میں سٹڈی سرکل بنا رکھے ہیں۔ان کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے جلدی میں اور اکثر ایسا ہی ہوتا کہ وہ یا تو جلدی میں کہیں سے آرہا ہوتا یا کہیں جارہا ہوتا ہے۔اور اسی وجہ سے اکثر شہر سے باہر ہی ہوتا ہے۔پولیس کی گرفت میں آنے کے بعد ان کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

مارکسی تصورات میں ذرائع پیداوار کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اس لحاظ سے زراعت کے شعبے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔لیکن بدقسمتی سے تقسیم کے فوراً بعد ہی بڑے بڑے زمینداروں،نوابوں اور جاگیرداروں نے زراعت کے شعبے پر اپنا مستحکم قبضہ کرلیا۔ان میں کچھ خاندانوں نے تو عالم گیر شہرت بھی حاصل کی ہے جن میں ٹوانے،نون، نواب،کھرل،گیلانی اور قریسی خاندان،راجے،مزاری سردار،بلوچ سردار،گھمبے اور بگٹی،گوندل،وڑائچ،جتوئی اور نیازی سردار قابلِ ذکر ہیں۔ان کو ہم پاکستان کے مجازی خدا بھی کہہ سکتے ہیں۔اس قسم کے ہزاروں قبائل،خاندان،اور نواب اس وقت بھی پاکستان کے سیاسی منظرنامے پر چھائے ہوئے ہیں۔

گمان کا اگلا کردار جمال اس لئے اہمیت کا حامل کردار ہے کہ ان کو اس ساری صورت حال کا بخوبی علم ہے اور اس وجہ سے ہی وہ پارٹی سے کچھ وقت کے لئے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور کسانوں کے ساتھ شامل ہو کر اُن کے لئے کام کرتا ہے۔جمال ہر وقت اپنی تنظیم کے کاموں کی وجہ سے دوروں پر رہتا ہے۔اس نے شہر سے بہت دور کرائے پر ایک مکان لیا ہوا ہے جہاں وہ کبھی کبھار ہی جاتا ہے۔لیکن ایک دفعہ جب وہ کچھ مارکسی لٹریچر اس مکان میں لے کر آتا ہے تو پولیس ان کو گرفتار کرلیتی ہے۔جیل میں اس کو میس کے کام پر معمور کرتے ہیں۔جیل میں رہنے پر جمال کہتا ہے:

جیل میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔جمال کہنے لگا۔ایک طرح سے قید کا عرصہ فائدہ مند ہی ثابت ہوا ہے بہت سے نئے رابطے ہوئے ہیں۔ان لوگوں سے عام حالات

میں ہوسکتا ہے ملاقات نہ ہو پاتی۔لوگ اپنے اپنے طور پر سیاست میں جتے ہوئے ہیں۔ان کو قریب لانے کی، منظم کرنے کی ضرورت ہے۔لوگوں میں زبردست صلاحیتیں اور جذبہ ہے۔انہیں ایک رخ، ایک سمت چاہیے۔ان کے خواب موہوم ہیں۔خاص طور پر پیپلز پارٹی کے کارکن۔ان میں جوش ہے، جذبہ ہے ہمت ہے اوران کی اکثریت ایماندار ہے مگران کا ہدف واضح نہیں ہے۔وہ ایک رومانس میں زندہ رہ رہے ہیں۔وہ نہیں جانتے کہ ان کے دکھوں کا مداوا شخصیت میں نہیں، بلکہ اجتماعی تبدیل میں پوشیدہ ہے۔کوئی ایک شخص کائنات کا مرکز نہیں ہے۔(۲۱)

مصنف کی بات میں شک نہیں کہ پیپلز پارٹی کے کارکن ایک شخصیت کے رومانس میں زندہ ہیں۔اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی بھٹو زندہ ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے بھٹو صاحب سندھ میں کسی جگہ روپوش ہیں اوران کی تلاش کا کام جاری ہے۔یا کسی گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے بھٹو اس گھر میں چھپے ہوئے تھے اوراب مل گئے ہیں ان کو پکڑنے کی ضرورت ہے۔اس سے بڑھ کو کوئی اور کرشماتی رومانس دیکھنے میں نہیں آیا۔

جمال کا تعلق کیمونسٹ گروپ سے ہے۔وہ اب اس گوریلا جنگ کی تیاری کے تانے بانے سوچتا ہے جو اس کو جیل سے باہر آ کر لڑنا تھی۔لیکن جب جمال جیل سے باہر آتا ہے تو اس کے خیالات کافی بدل جاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ میرا دل کرتا ہے کہ اب سب کچھ چھوڑ کو اپنے شہر راجن پور جا کر مقامی سیاست میں حصّہ لوں۔اس بنا پر یہ کردار بھی نامساعی حالات کی وجہ سے مارکسی فلسفے سے دور رہ کر اپنے شہر جانا چاہتا ہے۔

گمان میں کچھ چھوٹے کردار بھی ہیں جن کا مارکسی تصورات سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہے لیکن کسی حد تک وہ کردار مارکسی فلسفے پر یقین تو کرتے ہیں لیکن عملی طور پر ان کی کوئی کاوش نظر نہیں آتی۔ایسے کرداروں میں فہمیدہ سرِ فہرست ہے جو شروع میں تو اس کیمونسٹ گروپ کے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتی ہے لیکن پھر اسلام آباد میں ایک اچھی جاب مل جانے پر پارٹی سے الگ ہو جاتی ہے اوراس کے بعد اپنی بہن عفت کو بھی اپنے پاس بلا لیتی ہے۔ان بہنوں کا تعارف مرتضٰی کراتے ہوئے کہتا ہے:

۔۔۔۔یہ فہمیدہ ہے جرنلزم میں ایم۔اے کر رہی ہے۔اور یہ اس کی چھوٹی بہن عفت ہے۔ ابھی سیکنڈری سکول کے آخری سال میں ہے۔مگر اپنے وقت سے بہت آگے۔ہمیں اس

سے بڑی امیدیں ہیں۔فہمیدہ اور عفت نے انہیں سلام کیا اور بڑھ کر توحید اور کبیر سے ہاتھ ملایا، جن کا تعارف اب مرتضٰی کروا رہا تھا۔انہوں نے شطرنج کی بازی ایک طرف ہٹا دی اور گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ جمال اور فہمیدہ یونیورسٹی میں اکھٹے پڑھتے تھے۔یونیورسٹی تو جمال نے کب کی چھوڑ دی تھی، مگر جب بھی وہ مظفر پور آتا فہمیدہ سے ملنے ضرور آتا۔فہمیدہ دراز قد اور تیکھے نقوش والی خوش گفتار لڑکی تھی جس کے ہر انداز سے نفاست اور سلیقے کی جھلک نمایاں تھی۔اس کے برعکس عفت کے نقوش واجبی سے تھے تاہم اس کا انداز جارحانہ تھا۔اس کی بات، ہر حرکت میں تیزی تھی وہ کبیر کے بالکل پاس بیٹھی تھی جو پہلی بار کسی لڑکی کے اتنے قریب ہونے سے گھبرایا ہوا تھا۔۔۔(۲۲)

توحید کبیر کا چھوٹا بھائی ہے ایک رات اس کو آوارہ پھرنے پر فوجی روکتے ہیں اور اس سے کچھ باتیں پوچھتے کے بعد ان کو مرغا بنا کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے جس کے بعد توحید ہالینڈ چلا جاتا ہے اور کبیر کو بھی وہاں آنے کی دعوت دیتا ہے کہ اس ملک سے نکل آؤ۔

شہزاد کھیڑا بھی ایک مارکسی کردار ہے اور وہ بہت پہلے پارٹی میں کام کر چکا ہے۔شہزاد دیہاتوں میں جا کر سٹڈی سرکل لیتا ہے اور اس وجہ سے وہ سائیکل پر دور دور جا کر دیہاتوں کا دورہ کرتا ہے۔اس کے بعد ان کو ماسکو یونیورسٹی میں داخلہ مل جاتا ہے اور وہاں سے قانون کی ڈگری لے کر واپس آتا ہے۔لیکن اس کے بعد وہ بدل جاتا ہے اور کوئی بات بھی صاف انداز میں نہیں کرتا۔جب جمال اس سے دوبارہ پارٹی میں شمولیت کی کہتا ہے تو ایک دم میں اس کا مزاج برہم ہو جاتا ہے اور وہ ان پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے:

کچھ دیر بعد جمال نے اس سے پارٹی میں شمولیت کی بات شروع کی۔شہزاد کھیڑا کا مزاج ایک دم غیر متوازن ہو گیا۔پھر اس نے ان کی تمام پالیسیوں پر سخت تنقید شروع کر دی۔یہ کہ وہ لوگ حقائق سے کوسوں دور ہیں۔دنیا کہیں جا رہی ہے وہ نجانے کس قسم کی سیاست کر رہے ہیں۔ہمیشہ یہ لوگ لکیر ہی پیٹتے رہے ہیں۔پھر وہ اپنا لکھا ہوا ایک لمبا سا مضمون لے آیا۔اس کے مطابق اس مضمون میں اس نے عالمی تناظر میں پاکستان کے حالات کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور اس کے حل کی تجاویز بھی لکھی ہیں مضمون کے آخر میں اس نے اپنے اصلی نام

کے بجائے مزدک ایک دوسرا قلمی نام لکھا ہوا تھا۔ یہ مضمون میں بہت سی فوٹو سٹیٹ کاپیاں کروا کر مختلف لوگوں کو بھجوا رہا ہوں تا کہ اس پر بحث ہو سکے۔ ایک کاپی تم بھی لے جانا۔ پھر بات ہوگی۔ (۲۳)

کامریڈ کریم بھی کمیونسٹ کردار ہے جو راحت سے شادی کر لیتا ہے۔ ان کا مارکسی سیاست کا بہت گہرا مطالعہ ہے۔ کریم ہر وقت لوگوں کو کمیونسٹ تنظیم کے سخت ڈسپلن کے بارے میں آگاہی فراہم کرتا ہے۔

گمان کا ایک اور کردار شہریار ہے جو دیسی شراب پینے کا عادی ہے۔ اس کو آخری وقت تک پتا نہیں چل سکا کہ اس کا باپ کون ہے اور اب تو اس نے اس بارے میں سوچنا بھی ترک کر دیا تھا کہ میرا باپ کون ہے۔ اس کا بچپن مختلف شہروں میں گزرتا ہے۔ اس کی ماں ایک سکول میں پڑھاتی ہے۔ جن دنوں شہریار کالج میں تھا اس وقت اس کی ماں نے ایک رات ساری داستان سنائی کہ وہ تمہارے باپ سے محبت کرتی تھی اور اسی طرح آپ میرے بدن کا حصّہ بن گئے۔ اس کے بعد میں نے تمہارے باپ کو بتایا تو وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس نے اس کے باپ سے کہا کہ وہ وقتی طور پر اس پیدائش تک نکاح کر لیتے ہیں لیکن وہ نہ مانا، وہ اس مصیبت کو اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شہریار کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہوتا ہے اور یوں وہ اس جہان فانی سے کوچ کر جاتی ہے۔

مذکورہ بحث سے گمان کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ اس ناول میں ارشد وحید نے انسانی استحصال کی تاریخ میں جھانک کر اس کے ایک اہم حصّہ کو بیان کیا ہے کہ کس طرح پاکستانی سماج میں مارکسی تصورات کا رستہ روکا گیا اور بائیں بازو کی یہ تحریک پاکستانی سماج میں کن کن مسائل دوچار ہو کر اپنے انجام کو پہنچی۔ جس طرح ارشد وحید نے اس ناول میں مارکسی تصورات، سیاسیات اور پاکستانی سماج سے اس کا تعلق بیان کیا ہے وہ ان کی تخلیقی اظہار کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس ناول میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۹ء تک کے پاکستانی سماج کی سیاسی سماجی صورت حال کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ب: مستنصر حسین تارڑ: حیات و خدمات

مستنصر حسین تارڑ ۱۹۳۹ء کو جو کالیاں میں پیدا ہوا جو منڈی بہاوالدین کا ایک قصبہ ہے۔ والد کا نام رحمت تارڑ ہے جن کا زراعی بیجوں کا ایک سٹور ''کسان اینڈ کمپنی'' تھا جو بعد میں ایک منافع بخش کاروبار میں تبدیل ہو گیا۔

مستنصر حسین تارڑ نے ''مسلم ہائی سکول'' سے ۱۹۵۴ء میں میٹرک کیا۔ سکول کی تعلیم کے بعد ۱۹۵۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ کالج کی تعلیم کے بعد مستنصر حسین تارڑ برطانیہ چلا گیا جہاں اس نے اپنا زیادہ تر وقت کتب بینی کے لیے مختص کیا اور برطانیہ سے ہی ٹیکسائل کورس کا بھی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اس کے بعد ''جنرل سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن'' کی ڈگری بھی حاصل کی۔ مستنصر حسین تارڑ نے ۱۹۵۸ء میں ماسکو کے ''World Youth Festival'' میں بھی شرکت کی اور اس تمام سفر کی روداد کو اپنی مشہور کتاب فاختہ میں رقم کر دی۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز سفر نامہ لکھنے سے کیا۔ ان کا پہلا سفر نامہ لندن سے ماسکو ہے جو رسالہ قندیل میں چھپا۔ مستنصر حسین تارڑ کو سیر و سیاحت کا شوق ہے جس کا ثبوت اس کے سفر نامے ہیں۔ سفر نامہ نگار کی حیثیت کے بعد اب اُردو ادب میں بطورِ ناول نگار بھی ان کی حیثیت مستحکم ہو چکی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف اپنی کتاب اُردو ناول۔ تاریخ و ارتقا (آغاز سے اکیسویں صدی تک) میں لکھتے ہیں:

> سفر نامہ نگاری میں انہیں شہرت حاصل ہے۔ پہلا سفر نامہ لندن سے ماسکو لکھا جو رسالہ قندیل میں چھپا۔ سفر ناموں کے ساتھ ساتھ ان کے ناول بھی قارئین میں مقبول ہیں۔ انھوں نے مختصر سفر کیے ہیں سیر و سیاحت میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ سفر ناموں کے علاوہ دس سے زیادہ ناول لکھ چکے ہیں۔ ۲۴

سفر نامے اور ناولوں کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ نے ڈرامے، افسانے اور کالم نگاری میں بھی اپنی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو منوایا ہے۔

تارڑ کی کتب کی تفصیل اس طرح ہے:

سفر نامے

۱۔ نکلے تیری تلاش میں:

مستنصر حسین تارڑ کا مشہور سفر نامہ ہے جس سے ان کو ادبی دنیا میں شناخت ملی۔ اس سفر نامے کی اہمیت کا

اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا یہ سفر نامہ ماسکو یونیورسٹی کے نصاب کا حصّہ ہے۔

۲۔ اندلس میں اجنبی:

اندلس کے تاریخ پر مشہور سفر نامہ۔

۳۔ خانہ بدوش:

بیروت سے روم تک کیے گئے سفر کی داستان اور واقعات کا احوال۔

۴۔ پتلی پیکنگ کی:

چین کے متعلق ایک اہم اور دلچسپ سفر نامہ۔

۵۔ سنہری اُلو کا شہر:

ہندوستان کے مشہور اور تاریخی شہر دہلی، آگرہ اور فتح پور کے پس منظر میں لکھے گئے سفر نامے۔

۶۔ ماسکو کی سفید راتیں:

سوویت یونین کے پس منظر میں لکھا گیا اہم سفر نامہ۔

۷۔ الاسکا ہائی وے:

یہ کینیڈا کی ایک وادی کا نام ہے۔اس سفر نامے میں اس وادی کے حوالے سے بہت سی معلومات ملتی ہیں۔

۸۔ منہ ول کعبہ شریف:

اس سفر نامے میں مستنصر حسین تارڑ نے اپنے حج کے سفر کے حالات بیان کیے ہیں۔

۹۔ غار حرا میں ایک رات:

غار حرا میں ایک رات بسر کرنے کی سعادت پر لکھا گیا سفر نامہ۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے کچھ سفر ناموں میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات کو بھی اپنے تخلیقی اظہار کا موضوع بنایا ہے۔ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۰۔ ہنزہ داستان

۱۱۔ سفر شمال کے

۱۲۔ برفیلی بلندیاں

۱۳۔ چترال داستان

۱۴۔ رتی گلی

۱۵۔ یاك سرائے

۱۶۔ شمشال بے مثال

۱۷۔ دیو سائی

۱۸۔ سنو لیك

۱۹۔ کے ٹو کہانی

مستنصر حسین تارڑ کی ادبی تخلیقات میں موت کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔موت کا یہ تصور ان کے سفر نامے یاك سرائے میں بھی موجود ہے اور اس میں موت کو ایک کردار کے طور پر بیان کیا ہے۔اس وجہ سے یہ سفر نامہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔

افسانے:

۱۔ سیاہ آنکھ میں تصویر

۲۔ کوٹ مراد

۳۔ پریم

ٹی وی ڈرامے:

۱۔ ہزاروں راستے

۲۔ فریب

۳۔ پرواز

۴۔ صاحب سرکار

۵۔ کیلاش

۶۔ سورج کے ساتھ ساتھ

اکیسویں صدی کو اُردو ناول کی صدی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اکیسویں صدی کے پہلے اٹھارہ سالوں میں ۹۰ کے قریب ناول شائع ہو چکے ہیں۔ اس صنف میں بھی مستنصر حسین تارڑ پیچھے نہیں رہا بلکہ اکیسویں صدی میں ان کی ناول نگار کی حیثیت بہت مستحکم ہے۔ اس نے ناول نگاری کے نئے افق کی نشاندہی کی ہے۔ مستنصر نے ناول نگاری کو نئے انداز، میلانات، موضوعات، تشبیہات، عالمی سیاسی استعارے اور تکنیک کا ایک نیا نظام وضع کیا ہے۔ اس کے ناولوں میں کردار نگاری میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس کے ناولوں میں بہاو ایک اہم موضوع کا حامل ناول ہے جس میں وقت اور پانی کے باعث ایک بستی کے ختم ہونے کی داستان ہے۔ قربت مرگ میں محبت ایک ایسے بوڑھے ادیب کی کہانی ہے جس پر کئی عورتیں عاشق ہو جاتی ہیں۔ یعنی اس ناول میں مستنصر حسین تارڑ نے عورت کو نفسیات کے تناظر میں پرکھا ہے۔

ڈاکیا اور جولاہا میں مستنصر حسین تارڑ نے عورت کو جنسی پس منظر میں بیان کیا ہے۔ راکھ میں سیاسی و سماجی تاریخ کو موضوع بنایا ہے۔ قلعہ جنگی افغانستان پر امریکی حملے اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بربریت اور ظلم کو بیان کیا ہے تاکہ آنے والی نسل امریکہ کے اس ظلم کو فراموش نہ کردے۔ خس و خاشاک زمانے میں ۱۹۳۰ء سے لے کر 9/11 کے سانحہ تک مسلمانوں کی سیاسی سماجی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کو ناولوں کے بارے میں ڈاکٹر حمیرا اشفاق اپنی کتاب جدید اُردو فکشن عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات میں لکھتی ہے:

> ۔۔۔تارڑ نے لاہور شہر کی ثقافت کے حوالے سے ''راکھ'' جیسا ناول تخلیق کیا اور اس میں بھی وہ اپنے پرانے خیالات پر قائم رہے ''راکھ'' کے بعض حصّوں میں ''بہاؤ'' کی بازگشت موجود ہے۔ تارڑ کے تازہ ترین ناولوں میں۔ ''قربت مرگ میں محبت'' اور ''قلعہ جنگی'' شامل ہیں۔ ''قلعہ جنگی'' افغانستان پر امریکی کی حملے کی کتھا ہے تو ''قربت مرگ میں محبت'' ایک رومانوی فرد کی داخلی دستان ہے۔ (۲۵)

اعزازات:

۱ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی

۲ تمغہ برائے ناول راکھ از وزیراعظم پاکستان

۳ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ برائے عالمی فروغ اُردو ادب (قطر)

۴ سونے کا تمغہ برائے ادبی خدمات از ماسکو یونیورسٹی

۵ پاکستان کے بیسٹ سیلر اُردو مصنف

ج۔ اے غزالِ شب کا تعارفی مطالعہ:

اے غزالِ شب مستنصر حسین تارڑ کا اہم ناول ہے جو سنگ میل پبلیکیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس ناول کا انتساب بھی سنگ میل پبلیکیشنز کے مالک نیاز احمد کے نام ہے: ''میرے دوست اور میرے بھائی نیاز احمد کے لئے جو میرے ادبی سفر میں ایک سنگِ میل ثابت ہوئے!''۲۶

ناول کا آغاز ن م راشد کی ایک مشہور نظم اے غزالِ شب سے ہوتا ہے جس طرح قراۃ العین حیدر نے اپنے ناول آگ کا دریا کا آغاز ٹی ایس ایلیٹ کی نظم سے کیا ہے اور ان ناول نگاروں کا یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ ادا بھی مغرب سے مستعار لی گئی ہے۔

ناول کا آغاز آک کے ڈوڈے سے نکلنے والے گول سفید اڑنے والے روئی کے ریشوں سے ہوتا ہے جو اڑ کر ظہر الدین کی کار کی ونڈ وسکرین سے ٹکراتے ہیں اور یوں ظہر الدین فلیش بیک کی تکنیک کے سہارے ماسکو میں چلے جاتا ہے جہاں اُس کے خوابوں کی جنت تیار ہو رہی تھی۔ ان کے اس وہم کی طرف سویٹ لانا یوں اشارہ کرتی ہے:

> گالینا تو چپ رہتی۔۔۔ اپنی وہیل چیئر میں چُپ رہتی لیکن اُس کی بیٹی سویٹ لانا ایک طنزیا مسکراہٹ اپنے باریک ترشے ہوئے ہونٹوں پر سجائے کہتی تھی کہ ڈیڈی۔۔۔ ان دنوں آپ کھوسے گئے ہیں۔۔۔ آپ ہمہ وقت کسی خواب میں رہتے ہیں اور کسی آک کے بوٹے

میں سے جنم لینے والی سفید ہلکی پُھلکی روئی سے بھی ہلکی پریوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں جو مائی بوڑھیاں کہلاتی ہیں۔۔۔پلیز یوں حواس گم نہ کیجیے۔۔۔کچھ ضبط کیجیے۔۔۔یہ محض ایک ذہنی انتشار ہے۔۔۔آپ کا وہم ہے۔(۲۷)

ناول کا اہم کردار ظہر الدین ہے جس کو اپنے سرخ سویرا خواب کے پورا ہونے پر کامل یقین ہے۔سرخ سویرا کا نظریہ ان کے جسم وروح کا حصّہ ہے وہ اس نظریے سے کسی صورت الگ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی وہ کسی قیمت پر بکنے والا ہے۔یہ ایسا کردار ہے جس پر جیل کی سلاخوں کو بھی فخر ہے۔اس ایک مکمل کردار کو پڑھنے کے بعد سوویت یونین کی ایک ایک اکائی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ناول میں جو صورت حال اس کردار کی ہوتی ہے اس سے بھی بری صورت اس تحریک کی ہوتی ہے جس کے لیے اس نے اپنا تن من، دھن اور سارا ے خاندان کو تیاگ دیا ہے۔اس کی صورت حال کو مستنصر حسین تارڑ ان الفاظ مین میں بیان کرتا ہے:

کیا کبھی کسی نے اپنے کسی ایک خواب کی اتنی بھاری قیمت ادا کی تھی جتنی وہ کر رہا تھا۔۔۔اُس جیسے اور بھی بہت تھے۔۔۔مختلف قومیتوں اور نسلوں کے۔۔۔افریقی، ایشائی اور جنوبی امریکی جو اپنی آبائی شناخت اور عقیدے ترک کر کے ایک سرخ سویرے کی نمود کی چاہت میں یہیں اُس ''مزدور کی سلطنت'' میں رچ بس گئے تھے کہ وہ اُس جنت کے وعدوں پر کیسے یقین کرتے کہ اُن کے آس پاس انسانیت کے پاؤں میں جبر اور غربت کی زنجیریں تھیں، بے شک وہ قادر و عادل ہے لیکن اُس کے جہاں میں بندہ مزدور کے اوقات بہت سخت ہیں۔۔۔(۲۸)

پاکستان میں اس تحریک کو پھیلانے میں سوویت سفارت خانہ بہت ہی اہم کردار ادا کر رہا تھا۔دوسرے ملکوں کے سوویت یونین کے انقلابیوں کے لیے سفارت خانے نے اپنے خزانے کے منہ کھولے ہوئے تھے۔ایسے انقلابیوں کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کیا جا رہا تھا۔انقلابیوں کے بچوں کو ماسکو میں سکالرشپ دیئے گئے۔جو بچے یہاں پاکستان میں پڑھ نہیں سکتے تھے وہ ماسکو کی یونیورسٹی میں پڑھنے لگے اور کچھ سالوں تک اُن کو کچھ سمجھ نہ آیا تو نامراد واپس لوٹ آئے۔سوویت یونین کے سفارت خانے کی خدمات کا احاطہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

پاکستان میں سوویت یونین کا سفارت خانہ شمس الدین انقلابی ایسے نظریاتی مزدور لیڈروں

پر اپنی عنایات کی بارش کرنے کی کوشش میں مشغول رہتا لیکن شمس الدین ان عنایات کی بارشوں میں بھیگنے سے گریز کرتا کہ وہ کسی صلے یا ستائش کا تمنائی نہ تھا۔۔۔وہ دل و جان سے مساوات اور عدل پر مبنی ایک ایسے نظام کے لیے جدو جہد کر رہا تھا جس کا وعدہ اُس کے اسلام نے تو کیا تھا لیکن وہ ایفا نہ ہوا تھا لیکن جب سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری نے بہ نفس نفیس اُسے پیشکش کی کہ ہم آپ کے برخوردار کو ماسکو کی سٹیٹ یونیورسٹی میں جو بعد میں کانگو کے عظیم انقلابی پیٹرس لومبا کے قتل کے بعد پیٹرس لومبا یونیورسٹی کہلائی، ایک خصوصی سکالرشپ کے تحت پڑھائیں گے اور وہ اپنی پسند کے موضوع پر ڈگری حاصل کر سکتا ہے۔۔۔(۲۹)

لیکن یہ انقلاب زیادہ وقتوں تک مستحکم نہ رہ سکا اور اتنی تیزی سے ڈھیر ہوا کہ اس میں شامل سب انقلابی ہکا بکا رہ گئے کیونکہ اب ایسے انقلابیوں کے پاس کچھ نہ بچا تھا کہ وہ کوئی اچھی زندگی گزار سکیں۔اُنہوں نے تو اپنا سب کچھ اس انقلاب کے لیے وقف کر دیا تھا جو برے انداز سے ناکام ہو گیا۔لیکن جو لوگ رنگ بدلنے کے مالک تھے انہوں نے رنگ بدل لیے اور کچھ سوچے سمجھے بغیر وقت اور ہوا کے رخ کو بھانپ کر سرمایہ داری کو چاہنے لگے۔ان کو اب سرمایہ داری ہی کرنی تھی چاہے وہ نسوانی بدنوں کا ہی کاروبار کیوں نہ ہو۔اس حوالے سے لکھتے ہیں:

جونہی ایک سرخ سویرے کی جگہ ایک سرمایہ دارانہ ڈالر طلوع ہوا تو خلائی تسخیر کے ادارے۔۔۔سائنسی تحقیق کے منصوبے۔۔۔فنون لطیفہ کی ترویج ایسے خسارے کے سودے کوڑے دان میں پھینک دیئے گئے کہ ان میں مالی منفعت نام کو نہ تھی۔۔۔یہ کارِ لا حاصل تھے جن کے ذریعے صرف قومی فخر اور عزت نفس کی تشفی ہو سکتی تھی۔۔۔ایک آزاد اور جمہوری معیشت کا خاصہ ہے کہ دولت حاصل کرنے کے لئے اس کا کوئی ضابطہ اخلاق نہیں ہوتا چنانچہ انسانی گوشت کی برآمد اگر منافع بخش ہو سکتی تھی تو یہ بہترین معیشت تھی۔۔۔اس صنعت نے سوویت یونین کے انہدام کے وقت دن دونی اور رات چوگنی کہ یہ صنعت راتوں کو ہی عیاں ہوتی تھی، ترقی کی۔۔۔(۳۰)

جو لوگ اندھا دھند اس انقلاب میں بہے گئے تھے جب آنکھ کھلی تو ان کے آس پاس غیر یقینی کی صورت حال

تھی اوران کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔اور آخر کاران انقلابیوں کی اولادوں کو جو کام بھی میسر آیا بغیر کسی شرم اور جھجک کے کر ڈالا۔ایسے ہی ظہر الدین انقلابی کی بیٹی سوویت لانا تھی جو اپنا برہنہ جسم کی نمائش اور ڈانس دکھا کر روٹی روزی کمانے لگی۔اب اس کی اس کمائی سے اس کی ماں کا علاج اور گھر کا خرچ چلنے لگا۔

مستنصر حسین تارڑ نے پاکستانی کرداروں کو سوویت یونین کی سرزمین پر دکھایا ہے۔اس کی مثال ظہر الدین، مصطفٰی اسلام، سردار قالب اور عارف نقوی ہیں جو ماسکو کی سرزمین پر ہیں اور جیسے ہی حالات بدلتے ہیں ان میں سے کچھ انقلابی بھی ہوا کے رخ کو اختیار کر لیتے ہیں۔قادر قریشی نسوانی بدنوں کا کاروبار شروع کرتا ہے اور اس میں خوب ترقی کرتا ہے۔ظہر الدین انقلابی کی بیٹی سوویت لانا اپنے برہنہ جسم کا ڈانس دکھا کر پیسے کماتی ہے۔جینا اسلام اس سلسلے میں ساری دنیا کا مزا چکھ کر لاہور شہر میں آبستی ہے۔عارف نقوی تھیٹر کا اداکار ہے جو لکھنو میں کرشن بن کر ارجن سے مکالمہ کرتا ہے اور اسی طرح سوویت یونین کی سرزمین میں پہنچ جاتا ہے۔ آخر میں کردار اپنے دوست سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> تمہیں پتا ہے ہمارے اصل مجرم کون ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھ فریب کیا۔۔۔ترقی پسند شاعر اور دانش ور۔۔۔اُنہوں نے ہمیں خواب دکھائے، انقلاب کی آگ میں زندہ جلا ڈالا ۔۔۔ہم دیکھیں گے۔۔۔ہم تو نہ دیکھ سکے، نہ تاج اُچھالے گئے نہ تخت گرائے گئے اور نہ ہی خلق خدا نے راج کیا۔۔۔اور چاند کو گل کریں تو جانیں۔۔۔تو چاند بھی گل ہو گیا

مصنف کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مصنف نے تاریخی حقائق کو مسخ کر کے بیان کیا ہے جب کہ حقیت اس کے برعکس ہے۔یہ ترقی پسند ادب اور ادیب تھا جس نے پہلی مرتبہ نچلی کلاس اور پسے ہوئے طبقے کو ادب کا موضوع بنایا اور اُن کی کرب ناک زندگی کی داستان کو بیان کیا۔یہ آواز آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں سنی جا سکتی ہے جن میں پاکستان بھی سرفہرست ہے آج بھی بالا دست طبقے کی ریشہ دوانیاں نے عام لوگوں کو افلاس اور غربت میں مبتلا کر رکھا ہے۔پاکستان کے سیاسی منظر نامے پر آج بھی جاگیردار، صنعت کار اور وڈیرے چھائے ہیں جو ایک مثالی معاشرے کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔مذہبی حلقے آج بھی سرمایہ داروں کے مفاد کا شریک کار بنے ہوئے ہیں۔ستر سال پہلے بھی بیس فیصد افراد اسّی فیصد عوام کا مال غضب کر کے یورپی ممالک کے بینکوں میں جمع کر رہے تھے اور آج بھی یہ صورت برقرار ہے۔اس صورتِ حال سے ہمیں ترقی پسندوں نے ہی آگاہ کیا اور اس حوالے

سے شعور اجاگر کیا اور استحصالی طبقے کی آواز بن کر سامنے آئے اور ان بے رحم ظالم حکمرانوں سے ٹکرائے۔ اس سے پہلے ہمارے سامنے صرف گُل وبلبل کے قصّے ہی ہوا کرتے تھے۔ جبکہ ترقی پسندوں نے قوم کی ذہن سازی کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان حقائق کی وجہ سے مصنف سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف نے شاید اے آر شبلی کی کتاب پاکستان کے دہیہ خدا اور حال ہی میں شائع ہونے والی سٹیفن پی کوہن کی کتاب پاکستان کا مستقبل کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

اس لحاظ سے اے غزالِ شب کا موضوع بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں مارکسی تصورات کی تاریخ، اس انقلاب کے عروج و زوال، دوسری دنیا میں مارکسی تصورات کی صورت حال، پاکستانی اور ہندوستانی ادیبوں کی گمراہی کا خاکہ، کمیونزم کے بعد نئے روس کی اقتصادی صورت حال، انقلاب کے بعد سرمایہ داری کا ظہور، غربت کی چکی میں پسے ہوئے افراد کا المیہ، سوویت یونین میں پاکستانی کرداروں کی حالت زار، سرمایہ دارانہ اقدار پر تنقید، روس، پاکستان، طالبان، مذہب، سیاست، اشتراکیت کی شکست اور سرمایہ داری کی جیت کی تاریخ کو حقائق کی روشنی میں نہایت موثر کردار نگاری کے ذریعے اور عمدہ اُسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اے غزالِ شب ایسا آئینہ ہے جس میں ماضی کی تاریخ نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صفدر رشید فنِ ترجمہ کاری (مرتب)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص، ۵۷

۲۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اُردو ادب کی صورتِ حال، ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر اسد فیض۔ پورب اکادمی، سلام آباد، سن ۱۹۱۴ء، ص، ۸۷

۳۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، اُردو ناول۔تاریخ و اِرتقا (آغاز سے اکیسویں صدی تک)، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، سن، ۲۰۱۷ء، ص، ۴۰۵

۴۔ ارشد وحید، گمان، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۵

۵۔ منتظر مہدی، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو ناول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص، ۲۳۸

۶۔ ارشد وحید، گمان، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۵

۷۔ ایضاً، ص، ۱۱، ۱۲

۸۔ ایضاً، ص، ۱۹

۹۔ ایضاً، ص، ۲۱

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص، ۱۱۹

۱۱۔ ارشد وحید، گمان، ص، ۱۰۵

۱۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کے بدلتے نظریات، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، سن ۲۰۱۲ء، ص، ۱۵

۱۳۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، فقیر حسین، ڈاکٹر، (مرتبین)، اردو ناول کا ارتقاء، بک ٹاک، لاہور، سن ۲۰۱۴ء، ص، ۱۳

۱۴۔ ارشد وحید، گمان، ص، ۵

۱۵۔ ایضاً، ص، ۶

۱۶۔ ایضاً،ص،۵۰،۵۱

۱۷۔ ایضاً،ص،۶۱،۶۲

۱۸۔ ایضاً،ص،۱۸

۱۹۔ ایضاً،ص،۱۳،۱۲

۲۰۔ ایضاً،ص،۳۱،۳۲

۲۱۔ ایضاً،ص،۱۰۳

۲۲۔ ایضاً،ص،۲۴

۲۳۔ ایضاً،ص،۱۱۶

۴ محمداشرف،ڈاکٹر، اُردو ناول۔تاریخ و ارتقا(آغاز سے اکیسویں صدی تک ،ص، ۳۱۷

۲۵۔ حمیرااشفاق،ڈاکٹر،جدید اُردو فکشن عصری تقاضے اور بدلت یرجحانات،سانجھ، لاہور،سن،۲۰۱۰ء،ص،۸۷

۲۶۔ مستنصرحسین تارڑ،(انتساب)اے غزالِ شب،سنگِ میل پبلیکیشنز،لاہور،سن،۲۰۳۱ء

۲۷۔ ایضاً،ص،۵

۲۸۔ ایضاً،ص،۸

۲۹۔ ایضاً،ص،۹

۳۰۔ ایضاً،ص،۵۲

۳۱۔ ایضاً،ص،۱۶۸

باب سوم

گمان میں مارکسی تصورات اور پاکستانی سماج

ا۔ مارکسی تصورات اور پاکستانی سماج:

دنیا کا ہر ادب اپنے معاشرے کا آئینہ دار ہے۔ اگر آپ کسی ملک کے سیاسی و سماجی حالات جاننا چاہتے ہیں تو اس ملک کے ادب کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس لحاظ سے ادب اپنے دور میں ہونے والی تمام سیاسی و سماجی تبدیلی کا عکاس ہوتا ہے جس کی بناء پر ادب کا زندگی سے رشتہ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔

پاکستان کا اردو ادب بھی اپنے دور کا آئینہ دار رہا ہے۔ مسلم معاشروں میں جو بھی سیاسی و سماجی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ادیبوں نے اس کو اپنے تخلیقی اظہار کا موضوع بنایا ہے۔ انڈیا پاکستان کی تقسیم کے بعد ہی دونوں ملکوں کے عوام میں ایک بے چینی کی کیفیت برقرار رہی۔ ہر مکتبہ فکر نے اپنے اپنے مفاد کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس دور میں دونوں ملکوں میں دو طبقے واضح طور پر ابھر کر سامنے آئے ،ایک طبقہ تو ''بوژوائی'' کہلاتا ہے اور دوسرا ''پرولتاری''۔ ہندوستان میں تو پرولتاری (نچلے) طبقے کو ابھرنے نہیں دیا اور اس کے بدلے بورژوائی طبقہ حکومتی مشینری پر قابض ہو گیا اور اس طرح پاکستان میں جاگیردار طبقے نے اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑھ لیے۔ ایسے نقار خانے میں بے چاری عوام کی آواز کون سنتا۔

قیام پاکستان کے بعد سے ہی حالات ساز گار نہ تھے آئے دن حکومت کے ایوانوں تبدیلی کا شور رہتا اور عوام یہ سمجھتی کہ شائد یہ آخری تبدیلی ہو، آخری ڈرامائی قسط ہو اور اس کے بعد ہمیں اپنی منزل کو حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی لیکن عوام کی امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ ایسے میں صرف ادیب ہی تھے جو عوام کی آواز بن کر سامنے آئے اور جن کی تخلیقی و فکری تحریروں نے حکومتی ایوانوں میں بھونچال پیدا کر دیا۔ اس وقت ایک ایسی بے بسی، بے چینی اور غیر یقینی صورتِ حال تھی جو سمجھ سے باہر تھی۔ یہ 1960 کی دہائی کے دن تھے۔ اس دور کی غیر یقینی صورتِ حال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش کو گمان میں کبیر کے کردار کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے:

> گلی خاموش اور سنسان تھی۔ اب کہاں جاؤں، اس نے سوچا، اور پھر اپنی سوچوں میں گم اس گلی کے آس پاس پھرنا شروع کر دیا جو اس کے گھر کے قریب سے گزرتی تھی۔ سارا دن وہ مختلف جگہوں پر بے مقصد پھرتا رہا، مگر مدرسے اور گھر کے بیچ اب کوئی ایسی جگہ باقی نہ رہ گئی تھی جہاں وہ ٹھہر سکتا۔ (۲۲)

اس اقتباس سے عوام کی صورتِ حال کی عکاسی بخوبی ہو جاتی ہے کہ عوام کو اپنے مستقبل کی کوئی امید نہ رہی

تھی۔ایسے میں مارکسی نظریات سے وابستہ لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور عوام کو یہ یقین دلانے لگے کے آپ نے آزادی کا جو خواب دیکھا ہے وہ صرف ایک سراب تھا۔موجودہ حکمرانوں کی موجودگی میں آزادی کے خواب کی تکمیل نہیں ہوسکتی اُن کو اپنے خواب پورا کرنے کے لیے جدوجہد کو جاری رکھنا پڑے گا۔ان خیالات کا اظہار ہوتے ہی حکومتی ایوانوں میں بھونچال پیدا ہوگیا اور اس کا نتیجہ صدر ایوب خان کے مارشل لاء کی صورت میں سامنے آیا۔اس کا اظہار ناول میں اس طرح کیا گیا ہے:

> ماسٹر جان محمد۔۔۔تھوڑی ہی دیر میں سب باہر سڑک پر تھے۔ان کا جلوس مرکزی چوک کی طرف بڑھنے لگا۔کالج کے لڑکے سب سے آگے آگے تھے اور وہ ملک کے فیلڈ مارشل صدر ایوب خان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ان کے دیکھا دیکھی سکول کے لڑکے بھی ان کے نعروں کا جواب دینے لگے۔(۲۳)

اگر صدر ایوب خان کے دورِ حکومت کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ فیلڈ مارشل صدر ایوب نے مارکسی نظریات اور اپنے دوسرے سیاسی مخالفین پر وہ عتاب نازل نہیں کیا تھا جو بعد جنرل ضیاء الحق نے اپنے دور حکومت میں کیا۔اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنرل ایوب نے اُس وقت کے ترقی پسند اور مارکسی نظریات کے حامل شاعر فیض احمد فیض کو روس جا کر اپنا لینن انعام وصول کرنے کو کہا۔جس کا اثر یہ ہوا کہ ادیبوں نے جنرل ایوب کے خلاف وہ آواز بلند نہیں کی جو علامتی انداز میں جنرل ضیاء الحق کے خلاف باقاعدہ ایک تحریک کی صورت میں اٹھی۔اس کے برعکس کچھ ادیب تو صدر ایوب کے ہم خیال بن گئے۔اس کا تذکرہ شہزاد منظر اپنی کتاب پاکستان میں اُردو ادب کی صورتِ حال میں بیان کرتے ہیں:

> یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں فوجی آمریت ایوب خان کے دور میں بھی تھی لیکن اس دور میں کسی ادیب نے کوئی احتجاج اور غم و غصے کا اظہار اس طرح نہیں کیا جس طرح ضیاء الحق کے خلاف کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ۔۔۔پاکستان کے ادیبوں نے (جن میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں شامل تھے) رائٹر گلڈ کے پلیٹ فارم ان کا خیر مقدم کیا تھا ایوب خان کے دس سال تک برسر اقتدار رہنے کے باوجود فوجی آمریت کے خلاف کوئی افسانہ نہیں لکھا گیا بلکہ ادیبوں نے بنیادی جمہوریت (جو ایک طرح کی آمریت تھی) کی حمایت میں رائٹر گلڈ

کے پلیٹ فارم سے گن گائے۔(۲۴)

کچھ ادیبوں کو تو صدر ایوب جھانسا دینے میں کامیاب ہو گئے لیکن مارکسی نظریات پر مستحکم غیر متزلزل ادیب وشعراء اس جھانسے میں نہ آ سکے۔ان لوگوں نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا اور صدر ایوب کے خلاف جلسوں کا اہتمام کیا۔مارکسی نظریات کا حامل کردار جبار،صدر ایوب کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہتا ہے:

۔۔۔اس کی گردن کی رگیں تنی ہوئی تھی اور وہ پوری قوت سے حکومت وقت کو ختم کرنے کے عزم کا اظہار کر رہا تھا۔موجودہ صدر اور اس کے حامی،اس کے خیال میں،ایک بھاری پتھر کی طرح تھے جو ملک کی عوام کی ذہنی و مادی نشوونما میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ''خواہ جان بھی چلی جائے'' وہ کہہ رہا تھا''ہم ان لٹیروں سے نجات پا کر رہیں گے''۔(۲۵)

مارکسی تصورات اس لیے بھی پاکستانی سماج میں نہ پھیل سکے کیونکہ یہاں مارشل لاء نافذ تھا اور مارشل لاء دور میں اس قسم کے خیالات کے حامل کرداروں کو کس طرح پسند کیا جا سکتا تھا۔ایک ڈکٹیٹر یہ کس طرح پسند کر سکتا ہے کہ عوام میں اتنا شعور آ جائے جو اس کے اقتدار کے لیے خطرہ کا باعث بن جائے۔مارکسی کرداروں کو اس دور میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ان میں سے بہت سے کرداروں پر بدترین تشدد کیا گیا۔جب جبار حکومت وقت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے تو اس کو بھی پولیس تشدد کا نشانہ بناتی ہے لیکن وہ پولیس والوں کے چنگل سے چھوٹ کر راہ فرار اختیار کرتا ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی پولیس والے اس کا تعاقب جاری رکھتے ہیں اور اس کے گھر کی نگرانی کرتے اور سخت پہرا دیتے ہیں۔

پاکستانی سماج میں مارکسی تصورات کے لیے ایک بڑی رکاوٹ انڈیا اور پاکستان کی جنگیں بھی تھیں۔کیونکہ جنگ و جدل کے ایسے سخت اور مشکل وقت میں سرگرمیاں جاری رکھنا کٹھن ہوتا ہے اور ہر محبِّ وطن شہری کو اپنے وطن کا تحفظ عزیز ہوتا ہے۔ایسے میں مارکسی کردار بھی وقتی طور پر اپنے خیالات کو بالائے طاق رکھ کر وطن کی عظمت کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ناول کا کردار کبیر بھی جو ہر وقت خیالات کی الجھن میں مبتلا رہتا ہے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شہری دفاع کی تنظیم میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے اور طویل سرد راتوں میں سڑکوں پر ٹریفک کو کنٹرول کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ بلیک آؤٹ کی بھی نگرانی کرتا ہے کہ کوئی شخص طیاروں کو سگنل تو نہیں دے رہا ہے۔ایسے وقت میں مارکسی تصورات پر کس طرح کام جاری رکھا جا سکتا ہے۔

جولوگ اس نظریہ سے وابستہ تھے اُن کے لیے اس جہان میں اس سے بڑھ کر کوئی اور چیز پیاری نہ تھی۔اس نظریے کا ہر لفظ مقدس تھا وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اس کا تحفظ کرنے کو تیار تھے۔مارکسی ترانے ان کے لیے اذان سے کم نہ تھے۔ان کے پاس ہر وقت مارکسی لٹریچر ہوتا،لینن کے ترانے گاتے،ان کی تصویروں کو اپنے گھروں کی زینت بناتے،خفیہ طریقوں سے کارل مارکس،لینن اور چے گویرا کے مجسمے خریدنا ان کے لیے کسی فخر سے کم نہ تھا۔ان کا مکمل ضابطہ حیات مارکسی تصورات میں پنہاں تھا۔ان کی ہر بات اور ادا سے مارکسی ہونا صاف ظاہر ہوتا تھا۔مارکسی کرداروں کے گھروں کا نقشہ بھی عام گھروں سے بہت مختلف ہوتا۔گمان میں مرتضٰی کے گھر کا نقشہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> دیواروں پر ٹوٹتی ہوئی زنجیروں،اور کسرتی بدن والے،آسمان کی طرف تکتے ہوئے،ہاتھوں میں مشعل لئے انسانوں کی تصویروں والے زرد اور سرخ پس منظر کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ایک کونے میں اوورکوٹ پہنے اور بڑی سی داڑھیوں والے دو آدمیوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔کارنس پر ایک چھوٹا سا مجسمہ رکھا تھا۔سیاہ رنگ کا یہ مجسمہ ایک دراز قد آدمی تھا،جس نے انہیں کی طرح ایک لمبا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔اس کی انگلی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہوئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بہت بڑے مجمع سے خطاب کر رہا ہے۔کمرے کے ایک کونے میں پڑے ٹرنک میں ایک اخباری کاغذ والے پوسٹر کا ایک کونہ اٹکا ہوا تھا۔سرخ پس منظر میں یہ سیاہ رنگ سے بنا ہوا ایک نوجوان شخص کا خاکہ تھا۔جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی،سر پر ایک سپاہیوں والی ٹوپی رکھی تھی جس کے سامنے کے رخ پر ایک ستارہ بنا ہوا تھا،اور اس کے نیچے انگریزی میں لکھا تھا۔''چے گویرا''۔(۲۶)

گمان بائیں بازو کے حمایتی کرداروں کی تاریخ کے پس منظر میں لکھا گیا جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کی یہ ایک تاریخ ساز ناول بھی ہے جس کی ابتدا شرر اور اس کے معاصرین و مقلدین نے کی۔ایسے ناولوں میں تاریخ اور تخیل کو ایک ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔لیکن ایسے ناول،ناول نگاری کے فن کو نظر انداز کر کے ہی لکھا جا سکتا ہے۔ناول نگار کو چاہیے کہ وہ تاریخ کو ایسے ہی بیان کرے جیسا کہ وہ تھی یعنی اس میں مبالغہ شامل نہ ہو ورنہ ناول نگار کی شخصیت مسخ ہو جائے گی۔اس لیے ضروری ہے ناول نگار صرف تاریخی واقعات اور حقائق کو ہی بیان کرے۔اس حوالے سے

ڈاکٹر خالد اشرف اپنی شاہکار کتاب برصغیر میں اردو ناول میں لکھتے ہیں:

> مغرب سے مشرق تک آج سبھی ناقدین اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ تاریخی ناول لکھتے وقت مصنف کا یہ فرض ہے کہ وہ تاریخی حقائق کے Frame Work میں رہ کر ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔لیکن تاریخ کے حقائق کو نبھانا اور اس کے پہلو بہ پہلو فکشن کے اصولوں کو بھی مدنظر رکھنا آسان نہیں اس لئے نقادوں کا خیال ہے کہ مصنف اچھی تاریخ لکھ سکتا ہے یا ایک اچھا ناول لکھ سکتا ہے۔لیکن ایک ایسا تاریخی ناول لکھنا جو تاریخ کے واقعات اور فکشن کے اصولوں سے کما حقہ انصاف کر سکینا ممکن ہی ہے اس ضمن میں کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ اعلیٰ درجہ کے تاریخی ناول نگار کو تاریخ کے کم منور گوشوں کا انتخاب بطورِ موضوع کرنا چاہیے کیونکہ یہاں مصنف نسبتاً زیادہ آزادرہ کر اپنے کرداروں اور ان کی زندگی کے واقعات کو ترتیب دے سکتا ہے۔ (۲۷)

گمان میں بھی ان تاریخی حقائق کو پیش کیا گیا ہے کہ مارکسی کردار جاگیردارانہ نظام کو بدل کر اس کی جگہ ایک نیا نظام کمیونزم چاہتے ہیں ایسا نظام جس میں پسے ہوئے پسماندہ نچلے طبقات کے مسائل کو حل کیا جائے، جس میں دولت کی تقسیم مساویانہ انداز میں صلاحیتوں اور محنت کے مطابق ہو اور معاشرہ عدل پر قائم ہو جس میں کسی قسم کی اجارہ داری نہ ہو۔ گمان میں اس حقیقت کی بھی عکاسی کی گئی ہے کہ یہاں پر ایسے کرداروں کو مکمل آزادی نہیں تھی وہ اپنے مارکسی نظریات کا آزادانہ اظہار کرتے۔سخت پاکستانی سماجی گھٹن میں میں ایسے لوگ (مارکسی) اپنے گروہ میں ہی جا کر مارکسی خیالات کا پرچار کر سکتے تھے۔ گمان میں بھی ایسے کردار موجود ہیں جو آپس میں مارکسی نظریات کا اظہار کر رہے ہیں۔یہ سب اکثر مرتضٰی کے گھر جا کر اکٹھے ہوتے ہیں جہاں فہمیدہ بھی ان کے گھر آتی ہے جو اس وقت جرنلزم میں ایم اے کر رہی ہے۔اس کی چھوٹی بہن عفت بھی ان لوگوں میں شامل ہے جو ابھی سیکنڈری سکول کی طالبہ ہے۔مرتضٰی کے گھر آ کر یہ سب کردار ایک نئے نظام کو نافذ کرنے کی فکر میں ہیں۔مرتضٰی کے گھر میں موجود مجسمے بھی ان کے مارکسی ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔فہمیدہ مرتضٰی سے بات کرتے ہوئے کہتی ہے:

> ''ارے یار'' مارکس اور اینگلز کی تصویروں پر سے مٹی تو جھاڑ لیا کرو، فہمیدہ بولی اور پھر اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائے شخص کے سیاہ رنگ کے مجسمے کو صاف کرتے ہوئے، ہنستے

ہوئے کہا ''اور کامریڈ لینن کے ساتھ بھی تم کوئی اچھا سلوک نہیں کر رہے''۔ (۲۸)

گمان میں پاکستانی سماج کے کچھ ایسے لوگوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جو صرف کسی غیبی امداد کے انتظار میں آس لگائے بیٹھے ہیں۔ گمان میں ایسے کرداروں کی نمائندگی ''مظفر'' کے کردار کے ذریعے کی گئی ہے۔ اس کے خیال میں یہ سب تاریخی جبریت کے سوا کچھ نہیں اس لئے ہمیں تاریخی حالات کے مطابق ہی اپنا نصب العین متعین کرنا چاہیے۔ اس کے جواب میں مرتضٰی کہتا ہے:

> یہ تاریخی جبریت سب فراڈ ہے۔ یہ سب اسی طرح ہے جیسے مولوی جنت کے خواب دکھا کر موجودہ جبر صبر سے سہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ تم لوگ بھی بس لکیر کے فقیر بنے رہو۔ کوئی طریقہ حتمی نہیں۔ ہمیں نئے راستے بنانے چاہیں۔ تم لوگ بس مکھی پہ مکھی مارے جایا کرو۔ اور خوش رہو کہ بہت کام کر رہے ہو۔ مرتضٰی نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ (۲۹)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی سماج کو جتنا نقصان ان مولوی اور ملاؤں نے پہنچایا اتنا کسی اور نے نہیں پہنچایا۔ تقسیم سے قبل انہوں نے مغربی تعلیم کے خلاف فتوے دیے۔ عام لوگوں کو مغربی اور سائنس کی تعلیم سے دور رکھا کہ جو مغربی تعلیم حاصل کرے گا وہ اپنے مذہب اور اللہ سے دور ہو جائے گا اور قیامت کے دن شدید عذاب کا سامنا کرنے پڑے گا۔ پاکستان کے قیام کے بعد یہاں آ کر عام اور بے سہارا لوگوں کو جہاد کا درس دیا اور اپنے بچوں کو امریکہ میں اعلیٰ تعلیم اور کاروبار کے لیے راہیں ہموار کیں۔ سوویت یونین کے دور میں انہوں نے صدر ضیاء الحق کی آمریت کا ساتھ دے کر امریکہ کے کہنے پر جہاد شروع کر دیا اور امریکہ سے ''مجاہدِ اعظم'' کا لقب بھی لینے میں فخر محسوس کیا۔ سوویت یونین کے ٹکڑے ہونے کے بعد ۲۰۰۱ء میں امریکہ نے 9/11 کے نام نہاد جنگ شروع کر دی اور اس کے بعد امریکہ نے ان کو افغانستان کے پہاڑوں میں بھی چھپنے کے لیے جگہ نہ چھوڑی۔ اس وقت بھی یہ لوگ اللہ کی طرف سے غیبی امداد کے چکر میں تھے لیکن اس دفعہ کافروں کی جدید ٹیکنالوجی نے ان کے غیبی امداد کے نام نہاد دھوکے کا پردہ فاش کر دیا۔ آمریت، مولویت، طبقاتی تقسیم، جاگیردارانہ طرز حکومت اور مختلف مسالک کے فرقوں نے پاکستانی سماج کو درست نصب العین کا تعین نہیں کرنے دیا لیکن ان گھمبیر رکاوٹوں کے باوجود پاکستانی سماج میں مارکسی سفر مزدور کسان پارٹی کی شکل میں اب بھی موجود ہے، لیکن یہ لوگ فرد فرد ہونے کے باعث اب بھی اپنی طاقت کا مظارہ نہیں کر سکتے۔ پاکستانی سماج میں ان سب نظریات اور طبقوں کی کشمکش جاری ہے اور اس بات کا تعین

کرنا مشکل ہے کہ پاکستان میں کون سا نظامِ حکومت حاوی ہے۔اس حوالے سے عفت یہ سوچتی ہے:

> ملک کا نظام جاگیرداری پر مبنی ہے یا سرمایہ داری رشتے اور ذرائع اس پر حاوی ہو چکے ہیں، یا یہ کہ سب کچھ ملا جلا نظام چل رہا ہے، شہروں کی آبادی کیوں بڑھ رہی ہے۔قومیتوں کا سوال کیا ہے۔پاکستان میں اس کا اظہار کس طرح ہوا ہے۔اسے کس طرح حل ہونا چاہیے، مسلح جدو جہد کرنی چاہئے یا ابھی قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرنا چاہئے۔دیگر سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اتحاد کرنا چاہیے یا نہیں، اگر کیا جانا چاہیے تو کن اصولوں پر، پارٹی کو کھلے بندوں کام کرنا چاہیے یا نہیں، دوسرے فرنٹ کس طرح بنائے جائیں، انہیں کس طرح مربوط کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔(۳۰)

اس بات میں شک نہیں کہ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے علاوہ تمام سول ڈکٹیٹر شپ اور فوجی آمریت نے مارکسی فلسفے کے مقابلے میں سرمایہ داری کی بھرپور حمایت کی اور امریکہ نے پاکستان میں مارکسی تصورات کے پھیلاؤ اور اس کے فلسفے کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی اور اس پر بے حساب سرمایہ بھی صرف کیا۔اس کام کی انجام دہی کے لیے ہمارے مولویوں، لیگی حکمرانوں، اخبارات اور مختلف رسائل نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔اس کی بابت سید سجاد ظہیر اپنی کتاب مارکسی فلسفہ میں لکھتے:

> پاکستان کے مسلم لیگی اور رجعت پرست اخبار اور رسالے بھی دن رات خیال پرستی کے تنِ بے جان میں زندگی کا خون ڈورانے کے لئے بہت بے چین ہیں اور سوشلزم اور کمیونزم کے انقلابی فلسفے کی مقبولیت کو کم کرنے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی اور اپنے امریکی اور فرنگی آقاؤں کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ کمیونزم کا فتنہ پاکستان کی سرزمین پر سر نہیں اٹھا سکتا۔کیونکہ مسلمانوں میں عام طور سے اور پاکستان کے مسلمانوں میں خاص طور سے روحانیت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ امریکہ سرمایہ داروں کے ترجمان روزنامہ ''نیویارک ٹائمز'' نے حال ہی میں یہ کہہ کر اپنے ماہر اسلامیات ہونے کا ثبوت دیا ہے کہ کمیونزم کا زہریلا پودا پاکستان کی روحانی اور اسلامی فضاء میں بار آور نہیں ہوسکتا۔ (۳۱)

پاکستان میں ۱۹۷۰ء کا عشرہ اس ملک کی تاریخ کا حصّہ ہے۔ یہ دور بڑا افراتفری، بے چینی اور ہلچل کا دور تھا۔ سارے ملک میں ہنگاموں کی لہر برقرار تھی۔ ان ہنگاموں کے ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ پاکستان کی تمام جماعتیں اور فوجی حکمران ایک طرف تھے اور ذوالفقار علی بھٹو کی فہم وفراست ایک طرف۔ بھٹو کی رہنمائی ان کی عقل ودانش کر رہی تھی جبکہ باقی تمام مخالفین کی حمایت اور مدد امریکہ کر رہا تھا۔ اس سارے عمل میں بھٹو اپنے ذوالفقار علی ہونے کا عملی ثبوت دے رہا تھا۔ ان کے معروف مخالفین میں مولانا مودودی اور ایک شاہین کا بچہ جسٹس جاوید اقبال بھی پیش پیش تھے۔ جن کے پاس امریکہ کا بھرپور تعاون اور یقین شامل تھا جبکہ دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو جو مارکسی تصورات اور سوشلسٹ نظریات پر یقین رکھتے تھے جنہوں نے ان کے مقابلے میں ''روٹی ،کپڑا اور مکان'' کا ایسا نعرہ لگایا کہ ان کے سب سیاسی مخالفین اور ان کے امریکی آقا چکرا کر رہ گئے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے ہنگامہ خیز دور کی عکاسی ناول گمان میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> ملک میں جاری ہنگاموں کی لہر ختم ہونے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے۔ کب حالات پرسکون ہوں ۔۔۔ لگتا تھا کہ لوگوں کا کارواں ایک لمبے عرصے سے سڑکوں پر ہیں۔ 1977 کے انتخابات، ایک طویل انتخابی مہم تھی، جس میں نو سبز ستارے، آسمان سے زمین پر اتر کر ہل چلاتے ہوئے اپنی پوری قوت سے اس تلوار سے نبرد آزما تھے جو اپنے تئیں سیف ذوالفقار ہونے کی دعویدار تھی۔ سر پر رومال اور عمامہ باندھے، یا ٹوپی اوڑھے، مذہبی جماعتوں کے رہنما، ریٹائرڈ فوجی سیاستدان، اسیر سیاستدانوں کی بیویاں، گدی نشین، زمیندار مل کر جب کسی شہر میں داخل ہوتے تو ہر طرف ھل چلے کا شور سنائی دیتا۔ اسی طرح لکڑی کی بنی لمبی تلواروں کے جلوس ۔۔۔ 1970 کے گزشتہ انتخاب کے فاتحین کا مارچ بھی اسی شان وشوکت سے رواں دواں ہوتا سبز ستارے کسی حد تک روایتی اشرافیہ، جبکہ پیپلز پارٹی خود کو عام اور روشن خیال لوگوں کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتی تھی۔ یہ گہما گہمی بہت عرصے سے جاری تھی اور ہر فریق اپنی پوری قوت صرف کر کے اس بازی کو جیتنے کا جتن کر رہا تھا۔ مگر ہوا یوں کہ انتخابات ہوئے پیپلز پارٹی کو زیادہ نشستیں ملیں مگر جلوسوں کا وہی انتخابی تسلسل ایک حکومت مخالف تحریک میں بدل گیا، جو کسی صورت ان انتخابات کو منصفانہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا اور حکومت سے مستعفی ہو کر نئے سرے سے

منصفانہ انتخابات کے انعقاد پر اصرار کر رہا تھا۔(۳۲)

ریٹائرڈ فوجی، سر پر رومال اور عمامہ باندھے مولوی، مولانا مودودی اور دیگر سیاسی و مذہبی جماعتوں کی مدد اور حمایت، امریکہ کر رہا تھا تو دوسری طرف مغرب میں ہی بھٹو کے حق میں نظریاتی مہم کا آغاز برٹرینڈ رسل جیسے نابغہ روزگار چلا رہے تھے۔

جب بھٹو صاحب کو وزارت خارجہ سے الگ کیا گیا تو برٹرینڈ رسل روسی وزیر خارجہ کو ایک خط کے ذریعے ان الفاظ میں مخاطب ہوتے ہیں:

ڈیئر مسٹر گرومیکو

میں بڑی تشویش کے ساتھ اس دباؤ کا جائزہ لے رہا ہوں جو امریکہ کی طرف سے ایسے قوم پرست رہنماؤں پر ڈالا جاتا ہے جو اپنی قومی آزادی اور ملک کے حقیقی مفاد کے لئے کام کرتے ہیں اس دباؤ کو صدر نکرومہ اور پیٹرس لومبا ایسے رہنماؤں پر جس طرح استعمال کیا گیا ہے، اس کو ہم پوری طرح بے نقاب دیکھ سکتے ہیں۔

بالکل اسی انداز میں پاکستان کے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت خارجہ سے الگ کیا گیا ہے، میں جانتا ہوں کہ جناب بھٹو پاکستان کی آزاد خارجہ پالیسی اور سنہ 1960 کے پاک سوویت آئل ایگریمنٹ کے خالق ہیں، پاکستان اور سوویت یونین میں دوستانہ تعلقات کے لئے جناب بھٹو کی پیش عملی ایک نہایت ہی اہم قدم تھا، جس کے باعث پاکستان امریکی پالیسیوں کی غلامی سے نکل گیا۔ مجھے سوویت یونین کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ چین کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ تعلقات میں کسی قسم کی غیر موزونیت یا قباحت نظر نہیں آتی۔ تمام تر نیک تمناؤں کے ساتھ۔

آپ کا مخلص

(برٹرینڈ رسل) (۳۳)

یہ دور سرمایہ دارانہ، مارکسی اور سوشلسٹ نظام میں کشمش کا دور تھا جس کا احاطہ گمان ناول میں بخوبی

انداز سے کیا گیا ہے۔

مارکسی تصورات تیسری دنیا میں خصوصاً پاکستانی سماج میں اس لئے بھی کامیاب نہ ہو سکے کہ سوویت یونین کی طرف سے ان کی بھرپور پشت پناہی نہ ہو سکی اور نہ ہی کمیونسٹ اور سوشلسٹ ممالک میں آپس میں وہ اتفاق و اتحاد نہ تھا جو سرمایہ دارانہ ممالک میں موجود تھا۔ اس صورتِ حال کو تاریخی حقائق کی روشنی میں گمان میں یوں پیش کیا گیا ہے:

> جب چلی میں الاندے کی حکومت کا تختہ الٹا گیا تو ایک بین الاقوامی کانفرنس میں روس پر الزام لگایا کہ بحیثیت 'مدر پارٹی' کے اس نے تیسری دنیا کے ایک ملک میں انقلاب کا کامیاب دفاع کیوں نہیں کیا۔ سوویت یونین نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور برزنیف نے اعلان کیا کہ ''اب کوئی دوسرا چلی نہیں ہوگا'' اسی لئے جب افغانستان کے انقلاب کو سی آئی اے نے ناکام بنانا چاہا تو روسی افواج کو حرکت میں آنا پڑا۔ یہ انقلابی فریضہ تھا، جس طرح تمام سرمایہ دار ممالک ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں اسی طرح سوشلسٹ انقلاب کے تحفظ کے لیے بھی سارے سوشلسٹوں کو بھی اکٹھا ہونا چاہیے۔ (۳۴)

ہر نظام میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ عوام میں جلد از جلد مقبول ہو جاتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک جن میں پاکستان بھی شامل ہے ایسے ہی نظام کے انتظار میں تھے لیکن یہاں پر زیادہ عرصہ آمریت مسلط رہی جس کی وجہ سے یہاں مارکسی تصورات نہ پنپ سکے۔ پاکستانی سماج میں ایسے نظام کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے اور اس مارکسی فلسفے کو زیادہ تر ترقی پسندوں نے اپنے تخلیقی اظہار کا موضوع بنایا۔ مارکسزم میں زیادہ اہمیت انسان اور اس کے مادی ذرائع پر ہوتی ہے۔ انقلابِ روس کے بعد یہ نظام پس ماندہ معاشروں کے لئے امید کی کرن بن گیا۔ پاکستان میں بہت سے غریب اور پسے ہوئے طبقہ کو اس میں اپنی فلاح نظر آئی۔ جس میں ان کے لئے اس مارکسی نظام میں ایک مثالی معاشرے کی تشکیل نظر آ رہی تھی۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد افضال بٹ اپنی کتاب اُردو ناول میں سماجی شعور میں یوں رقم طراز ہیں:

> مارکسی تحریک نے انسان کو داخلی دنیا کے بجائے خارجی کائنات سائنسی انداز فکر کے ساتھ تجزیہ کرنے کی طرف راغب کیا۔ اس کے نقطہ نظر کے مطابق مثالی معاشرہ قائم کرنے کے لیے معاشرے میں اقتصادی آویزش کا خاتمہ کرنا ضروری ہے۔ یوں اس نے اپنے نظریات

میں مادہ اور ذرائع پیداوار کو بنیادی حیثیت دی۔ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے انقلاب کے بعد جب معاشرے کے خارجی ڈھانچے میں تبدیلی آتی ہے تو علوم و فنون جو خارجی عوامل سے تشکیل پاتے ہیں معاشرتی ارتقاء میں خاصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اس تحریک نے خیال کو ماحول اور حالات کے تابع قرار دے کر ادب کو ایک واضح سماجی فریضہ سونپ دیا۔سماجی مساوات کے تصور نے ادیبوں کو متاثر کیا اس لیے انہوں نے شخصی آزادی، پیداواری منافع کی تقسیم اور نچلے طبقے کی اقتصادی ترقی کو اہمیت دی۔ادب کو ان نظریات کے فروغ کا وسیلہ بنایا۔اس کے بعد ادب کا تعلق سماج اور سیاست سے براہ راست ہو گیا۔ادب میں اور بالخصوص فکشن میں سماجی حالات اور سیاسی حادثات کا ذکر ہونے لگا۔(۳۵)

گمان ناول میں بھی اس سماجی تاریخ کو حقائق کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جس مارکسی تصورات، عام انسانوں کی برسر اقتدار قوتوں سے کشمکش، غیر منصفانہ معاشرے کی تشکیل اور اس کے بعد ایک منصفانہ سماج کی تشکیل کا خواب، مادی ذرائع پیداوار کی اہمیت، ادب کا سماج اور سیاست سے تعلق، نچلے طبقے کی اقتصادی صورتِ حال، پاکستانی سماج میں بائیں بازو کی تحریک اور سرخ سویرا کے خواب کا احاطہ دلکش انداز میں موضوع بحث بنایا ہے۔

گمان میں بائیں بازو کی تحریک کو تاریخی حقائق میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح انقلاب روس کے بعد اس تحریک نے پاکستانی معاشرے میں اپنے آپ کو جنم دیا، کس کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اس تحریک کے بہت سے کارکنوں کو پابند سلاسل کیا گیا، فوجی آمریت میں جبر کا نشانہ بنایا گیا۔اور بہت سے عملی کارکنان کو پھانسی دے کر خوف وحراس پھیلانے کے لیے عبرت کا نشانہ بنایا گیا۔بعد میں کس طرح اس تحریک کے بہت سے کارکن منظر سے غائب ہوتے گئے اور اچھی نوکری ملنے کے بعد اس تحریک سے اپنا تعلق ختم کر لیتے تھے۔کچھ کارکنان کو این جی اوز کے جال میں پھنسایا گیا۔جس طرح فہمیدہ کو جب اچھی نوکری ملی تو خود بھی بائیں بازو کی تحریک سے الگ ہو گئی اور اپنی بہن کو بھی اس تحریک سے علیحدگی کا مشورہ دے کر اُن کو کراچی آنے کی دعوت دیتی ہے۔اسی طرح اس تحریک سے وابستہ کردار جمال اپنے مستقبل کے بارے میں اس طرح بات کرتے ہیں:

میں سوچ رہا ہوں، جمال کچھ دیر بعد بولا۔اب میں اپنے شہر راجن پور ہی شفٹ ہو جاؤں

گا۔ وہاں مقامی سیاست میں حصّہ لوں گا۔ اس اتنے بڑے زون کو میں صحیح طور پر نہیں چلا پا رہا۔ اپنے شہر میں رہنے سے کچھ مالی حالات بھی بہتر ہو جائیں گے۔ ویسے بھی لگتا ہے میں کچھ تھک سا گیا ہوں، جمال چارپائی پر دراز ہو گیا اور آنکھیں موند لی۔ تھوڑی دیر میں اسے نیند آ گئی۔ (۳۶)

بائیں بازو کی یہ تحریک پاکستانی سماج میں کامیاب نہ ہو سکی اور نامساعی حالات، آمریت کا جبر، سرمایہ کی شدید کمی، آپس کے تضادات، شعوری کشش کا نہ ہونا، منظّم تنظیم کا نہ بننا، جامع منصوبہ بندی کی حکمت عملی کا فقدان اور افغانستان میں سوویت یونین کی پسپائی کی وجہ سے پاکستانی سماج میں یہ پارٹی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر تتر بتر ہو گئی۔ اس کا اظہار پرویز، کبیر سے کرتے ہوئے کہتا ہے:

یہ ساری کائنات ہم نے تو نہیں بنائی، نہ ہی ہم اس دنیا میں اپنی مرضی سے آئے ہیں۔ نہ ہی زندگی، اس دنیا کے نظام پر ہمارا کنٹرول ہے۔ بس آ گئے ہیں یہاں، اب محض جینا چاہیے۔ ویسے بھی زندگی لوگوں میں جا کر ہی سمجھ آ سکتی ہے۔ یہاں اس کمرے میں نہیں۔ تمہارا ہی خیال تھا کہ ہم اس مرحلے پر شکست کھا گئے ہیں۔ عالمی سطح پر بھی سوشلسٹ کیمپ تقریباً ختم ہی ہو گیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے تم نے اس شکست کو ابھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ ہمیں اس دنیا کا تجزیہ اپنے تصور کے پیمانوں پر نہیں کرنا چاہیے۔ جس طرح یہ بے مہر ہے، ویسے ہی اس کا تجزیہ ہونا چاہیے۔ یہ ساری دنیا ہمارے کندھوں پر نہیں ہے۔ ہمیں بس خوشی اور مسرت کی تلاش کرنی چاہیے۔ جہاں سے بھی ملے۔ صرف جینا اہم ہے۔ (۳۷)

ارشد وحید نے اس ناول میں پاکستانی سماج کی حقیقت پسندی، بائیں بازو کی تحریک کی ناکامی، نظریاتی کشمکش کی کی جھلک اور پاکستانی لوگوں کی آرزوں، امنگوں اور آدرشوں کی شکست کا مکمل بیان پیش کیا ہے۔ یہ بیان پاکستانی سماج کی سیاسی تاریخ کا حصّہ ہے۔ مذکورہ بحث سے جو مارکسی تصورات ہمارے سامنے آتے ہیں ان کو ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

۱۔ مارکسزم کے تحت جب سماج کا مطالعہ کیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ دنیا میں جو بھی تبدیلی ہوتی ہے اُس کے کچھ محرکات بھی ہوتے ہیں۔ اس بناء پر جب مارکسی تصوارت کا جائزہ لیا گیا تو اس میں مارکسی سائنسی

نقطہ نظر بھی شامل ہو گیا۔

۲۔ سماج میں تبدیلی سرمایہ داروں کے قوانین کی بدولت ہی آئی ہے جس کے بغیر سرمایہ دارانہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اور پاکستانی جیسے سماج میں سرمایہ داری پر غلبہ پانے کے لیے امریکہ ان کی پشت پناہی کرتا ہے اور ایسے سماج میں آمریت کو ہی بہترین طرز حکومت قرار دیتا ہے۔

۳۔ پاکستانی سماج میں سرمایہ دارانہ نظام کس طرح حاوی ہوا۔

۴۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ذرائع پیداوار کی کیا اہمیت ہے۔

۵۔ سرمایہ دار اور مزدوروں کی کشمکش کا سبب۔

۶۔ سرمایہ داری کا سامراجی دور کا آغاز اور اس کے قوانین

۷۔ طبقاتی کشمکش کا آغاز کیسے ہوا؟

۸۔ اشتراکی نظام جس نے کمیونزم کے بطن سے ہی جنم لیا ہے کا اہم اصول مشترکہ ملکیت ہے جس میں تقسیم انسانی ضرورت کے تحت کی جاتی ہے۔ اور ان تمام نظریات سے مارکسزم کا مادی تصور جنم لیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اُردو ادب کی صورتِ حال، ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر اسد فیض۔ پورب اکادمی، سلام آباد، ۱۹۱۴ء، ص ۸۷

۲۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، اُردو ناول۔تاریخ و اِرتقا(آغاز سے اکیسویں صدی تک)، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، سن، ۲۰۱۷ء، ص ۴۰۵

۳۔ منتظر مہدی، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو ناول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص، ۲۳۸

۴۔ ارشد وحید، گمان، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۱، ۱۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۹

۷۔ ایضاً، ص ۲۱

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۹

۹۔ ارشد وحید، گمان، ص ۱۰۵

۱۰۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کے بدلتے نظریات، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵

۱۱۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، فقیر حسین، ڈاکٹر، (مرتبین)، اردو ناول کا ارتقاء، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص، ۱۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۰، ۵۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۱، ۶۲

۱۶۔ ایضاً، ص۱۸

۱۷۔ ایضاً، ص۱۳،۱۲

۱۸۔ ایضاً، ص۳۱،۳۲

۱۹۔ ایضاً، ص۱۰۳

۲۰۔ ایضاً، ص۲۴

۲۱۔ ایضاً، ص۱۱۶

۲۲۔ ایضاً، ص۵

۲۳۔ ایضاً، ص۵

۲۴۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اُردو ادب کی صورتِ حال، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۳۷

۲۵۔ ارشد وحید، گمان، ص۱۳

۲۶۔ ایضاً، ص۲۳

۲۷۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص، ۲۲۸

۲۸۔ ارشد وحید، گمان، ص۲۵

۲۹۔ ایضاً، ص۳۱

۳۰۔ ایضاً، ص۴۲

۳۱۔ سید سجاد ظہیر، مارکسی فلسفہ، فکشن ھاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۱۳

۳۲۔ ارشد وحید، گمان، ص۴۶

۳۳۔ مولانا کوثر نیازی، دیدہ ور: ذولفقار علی بھٹو، احمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت پنجم، ۲۰۰۶ء،

ص۷۸

۳۴۔ ارشدوحید، گمان،ص۶۶

۳۵۔ افضال بٹ،محمد،ڈاکٹر،اُردو ناول میں سماجی شعور،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۰۹ء،
۹۸،۹۷

۳۶۔ ارشدوحید، گمان،ص۱۳۹

۳۷۔ ایضاً،ص۳۲۳،۳۲۴

باب چھارم

اے غزالِ شب میں سقوط سویت یونین کے بعد سرمایہ داری کا ظہور

الف: اے غزالِ شب کا تعارف

اے غزالِ شب مارکسی نظریات وتصورات پر مبنی ناول ہے۔اس کے پس منظر میں پاکستانی سماج اور روس کا منظر نامہ ہے۔سوویت یونین اور اس کے انہدام کے بعد سرمایہ دارانہ نظام سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا بیان ہے۔دسمبر ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین USSR ٹوٹ جاتا ہے۔سوویت یونین میں شامل تمام ممالک بغیر کسی جدوجہد کے علیحدگی کا اعلان کر دیتے ہیں۔سوویت یونین میں آخر دن تک بھی تعلیمی اداروں میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کی خلاف تعلیم دی جاتی اس کے باوجود لوگ سرمایہ دارانہ نظام کو اپنانے لگے۔وہی نظام جس کے متعلق پڑھایا جاتا تھا کہ اس میں لوٹ مار ہے، ذاتی مفاد کے لیے انسانیت کو پامال کرنا اور جس نے طبقاتی کشمکش کو جنم دیا ہے۔

روسی پاسپورٹ کو باوجود بھی یہ ''غیر ملکی سور کے بچے، حرامی''، یہ کل کے بادشاہ آج نئے نظام میں بے کار ہو کر رہ گئے۔ اے غزالِ شب میں پاکستانی کردار نہیں بلکہ ہر وہ نظریاتی کردار جو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھا سوویت یونین کے انہدام کے بعد مالی حالت کی خرابی کے سبب ذہنی مریض بن گئے۔چند نظریاتی افراد نے نئے نظام سے سمجھوتہ کر لیا۔چند نے مزاحمت کا راستہ اپنانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔اسی نظریے سے وابستہ افراد کے المیے اور کرب کو اے غزالِ شب میں دکھ بھرے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد نظریاتی افراد سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ان کے ساتھ فی الحقیقت کیا ہوا؟ اب کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہوگا؟ عمر کے اس حصے میں مارکسی کرداروں کے لیے واپسی کا سفر ناممکن نظر آ رہا تھا اور ان کرداروں کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے انتہائی پستی میں چلے گئے۔

مستنصر حسین تارڑ نے روس کی اس سیاسی اتار چڑھاؤ اور معاشی شکست کو ناول کا موضوع بنایا ہے جو کرداروں کے سیاسی سماجی اور معاشی پہلو کو بیان کرتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ نے جس اُسلوب میں سوویت یونین کے عروج وزوال کو بیان کیا ہے یہ ان کی خداداد صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ناول میں نظریے سے وابستہ افراد کا اور ایک عظیم تہذیب کا زوال پیش کیا گیا ہے۔ناول پڑھتے ہوئے قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ اس ناول میں اشتراکیت کا عروج وزوال اور کرداروں کی شکست کو بیان کیا ہے۔ناول میں دیوارِ برلن کے گرانے کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو اس نظام کی شکست کی علامت بھی ہے۔

اے غزالِ شب میں مستنصر حسین تارڑ نے اشتراکیت کے انہدام کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کے ظہور

کی صورت حالت کو بھی بیان کیا ہے۔سوویت یونین کا قیام ایک ایسا خواب تھا جس میں ایک غیر طبقاتی سماج اور مزدوروں کی سلطنت قائم کرنا تھا جس کے لیے مارکسی رہنماؤں نے اَن تھک محنت اور خدمات سرانجام دی تھیں۔اس خواب کو عملی صورت دینے والوں میں مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والوں لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی پُر زور مخالفت اور مزاحمت کی۔

سوویت یونین محض ایک سیاسی دھانچہ نہیں بلکہ ایک غیر طبقاتی اور مزدوروں کی سلطنت کے خواب کی تعبیر تھا۔یہ مارکس کی تعلیمات پر مبنی ایک تجربہ تھا۔جو بہتر (۷۲) سال اپنے عروج وزوال کے ساتھ قائم ودائم رہا۔

سقوط سوویت یونین کے بعد سرمایہ داری کا ظہور اپنے ساتھ اُن منفی اقدار کو بھی لایا جن کو ہر اخلاقی مہذب معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے جن میں عریانی، جسم فروشی، جوا، سگریٹ نوشی، شراب اور کلب کلچر قابلِ ذکر ہیں۔اس طرح انسانی جسم ایک پراڈکٹ کے طور پر استعمال ہونے لگے۔

اے غزالِ شب میں کرداروں کی غیر ملکی سرزمین پر ہجرت کو بھی بیان کیا ہے کہ کیسے کردار اپنے نظریے کے لیے آبائی وطن چھوڑ کر سوویت یونین کا حصہ بن جاتے ہیں جہاں وہ ایک مساوی اور استحصال سے پاک نظام چاہتے ہوئے مزدوروں کی سلطنت کے قیام کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں۔لیکن انہدام کے بعد واپسی کا سفر اور اس ہجرت کا کرب ناول میں پیش کردہ کرداروں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔یہ کردار اپنے نظریات کی بنا پر اپنے شہروں اور وطن کو چھوڑ کر اپنی نظریاتی وابستگی کے ممالک میں جا بستے ہیں۔

اے غزالِ شب میں بیان کردہ کردار معاشی طور خوش حال گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے مگر سوویت یونین USSR میں ان کو زندگی بہتر کرنے کے مکمل مواقع ملتے ہیں۔ناول میں بنیادی طور پر اشتراکیت اور نئے نظام (سرمایہ دارانہ نظام) کے مابین مزاحمت اور مفاہمت کا موضوع بیان کیا گیا ہے کہ کیسے مارکسی کردار نئے نظام میں بہہ گئے۔یہی موضوع اے غزال شب میں ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت رکھتا ہے۔

بورے والا کا ظہیر الدین سوویت یونین کے انہدام کے بعد اپنی قدر کھو بیٹھتا ہے۔روسی اس کو دیکھ کر ''حرامی، سور کے بچے، غیر ملکی'' کہتے ہیں۔ایسے میں مارکسی کردار عدم استحکام، عدم تحفظ اور بے روزگاری کا سبب نئے نظام میں ناکارہ ہو جاتے ہیں اور ان کی حیثیت ایک استعمال شدہ کنڈم کی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اے غزالِ شب کے حوالے سے ڈاکٹر قراۃ العین طاہرہ لکھتی ہے:

> اے غزالِ شب کمیونزم کی تاریخ کا خاکہ بھی ہے اور اسکے عروج و زوال کی کہانی بھی۔ یہ افراد کی داستان بھی ہے اور اقوال کا احوال بھی اور جغرافیائی حدود میں بٹے ملکوں کی کتھا بھی۔(۱)

اے غزالِ شب میں سقوط سوویت یونین کے ساتھ ہی سرمایہ داری کے ظہور کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ سرخ سویرا کو سرمایہ دارانہ نظام نے شکست کا منہ دکھایا۔ لیکن سرماہی دارانہ نظام نے دنیا کو فحاشی، دہشت گردی، اور غیر یقینی معاشی صورت حال کے سوا کچھ نہیں دیا۔ ایک آزاد اور جمہوری معیشت کا تقاضا بھی یہی ہوتا ہے کو دولت بڑھانے کے لیے سب کچھ کرنا جائز اور لازم ہو جاتا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی اخلاقیات اور نظریات کا عمل دخل نہیں ہوتا صرف اپنا مالی مفاد درکار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قراۃ العین طاہرہ مزید لکھتی ہے:

> جسمانی، ذہنی، ارضی، روحانی جلاوطنی، آزادانہ ی ارضا کارانہ نقل مکانی یا ترک وطن کے پس منظر میں تحریر کردہ اس ناول اے غزالِ شب میں مصنف نے پاکستان کے معصوم اور سادہ لوح عوام کو اندرونی و بیرونی سازشی دماغوں سے ہوشیار رہنے کا انتباہ کر رہے ہیں، بصورت دیگر انہیں آہ کرنے کا بھی موقع نہ ملے گا۔(۲)

اے غزالِ شب کے کرداروں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کردار ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ ان کا ایک یہ خواب اشتراکیت، غیر طبقاتی سماج کا خواب جس کی خاطر اپنے وطن، اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ کر دوسرے اشتراکی ممالک USSR میں جا کر رہنے لگتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی برطانیہ کالونی کی سازشوں کی وجہ سے ان کے خواب سرمایہ دارانہ نظام کی نظر ہو جاتے ہیں۔ یہ کردار جو سوویت یونین میں عزت و وقار اور رتبہ رکھتے تھے اب نئے نظام کے تیار شدہ فریم ورک میں ''ناکارہ غیر ملکی حرام زادے'' ثابت ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس نئے نظام کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں جبکہ کچھ کردار اس نظام میں مصلحتاً ڈھل جاتے ہیں۔ اور اسی کو اپنی باقی ماندہ زندگی کا حصول سمجھنے لگتے ہیں۔

اے غزالِ شب میں ہجرت کا موضوع بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اشتراکی معاشرے اور مساوات کا خواب لے کر یہ لوگ اشتراکی معاشرے کا حصہ بنتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اے غزال شب کا موضوع حصول دولت

بھی ہے کہ کس طرح لوگ اپنے مفاد اور دولت کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ نظام بدلتے ہی اشتراکی کردار بھی نظریاتی و عمل طور پر کروٹ لیتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وارث چوہدری تو خود سرمایہ دارانہ نظام کا ایک نمائندہ ہے لیکن وہ ظہیر الدین کو اس نظام کا پرچار ان الفاظ میں کرتا ہے:

> میں تمہاری طرح ایک کونے میں اپنے بدن میں کبھی خوابوں کی کرچیوں کی اذیت سے لطف اندوز ہوتا اپنے آپ پر ترس کھاتا زندگی نہیں کرسکتا تھا.. چالیسیوں کے بعد میں اس نئے سرمایہ دارانہ نظام کے اکھاڑے میں اتر آیا کہ ٹھیک ہے اگر قوت، لالچ، بے حسی اور بے رحم انسانی لوٹ کھسوٹ کا یہی امتحان ہے تو مجھ میں بھی ایک لیل پوری روح ایسی ہے جو دل سے مفاہمت کئے بغیر سب کو پچھاڑ سکتی ہے.... میں ایک اپنے آپ پر ترس کھانے والا شخص نہیں ہوسکتا..(۳)

اے غزالِ شب میں اشتراکیت کے انہدام کے ساتھ سرمایہ دار کے ظہور کو موضوع بنایا گیا ہے کہ اس نئے نظام سے سماج میں کس طرح لوگ حصول دولت اور منافقت سے کام کرتے ہوئے لوگوں کا استحصال کرنے لگے اور سرمایہ دارانہ نظام انسانی جسم بطور گوشت، جسم فروشی اور پوپ میوزک کے نمائندہ نظام کے طور پر ظہور میں آیا۔

ناول اے غزالِ شب میں سرمایہ دارانہ نظام کا ایک نمائندہ کردار قادر قریشی جو مذہبی چہرہ بنا کر کیسے اپنے آپ کو محفلوں میں اپنی عزت برقرار رکھتا ہے۔ قادر قریشی جو اپنے مفاد کے لیے لوگوں کو لالچ دیتا ہے۔ لالچ کی صورت میں شراب اور چھوٹی چھوٹی عمر کی لڑکیاں پیش کرتا ہے۔ ہاتھوں میں تسبیح، نعت کی محفل سجانا، جبکہ روسی غیر ملکی پڑھی لکھی خواتین کو جسم فروشی کے طور پر استعمال کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتا۔ یہاں تک کہ ظہیر الدین جو کہ ایک نظریاتی مارکسی کردار ہے ان سے کہتا کہ لینن کے مجسمے پگھلا کر مجھے دو آپ کو اس سے فائدہ بھی ملے گا۔ قادر قریشی ایک سرمایہ دارانہ نظام میں ایک معزز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے کاروبار کے حوالے سے وہ یہ دلیل پیش کرتا ہے:

> ویسے تم لوگ مجھ سے اس لیے گریزاں رہتے ہو ناں کہ میں مقامی مال غیر ملکی منڈیوں میں سپلائی کرتا ہوں، اعتراض کرتے ہو.. تو برادر تم جیسے لا مذہب لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ

ایک دینی مسئلہ ہے جس میں کچھ قباحت نہیں.. یہ سب جنہیں میں برآمد کرتا ہوں کفار کی بیٹیاں ہیں..ایک طرح سے کنیزیں ہیں، مال غنیمت ہیں تو ان کا کاروبار عین شرعی ہے بلکہ سچ پوچھو تو میرا ایمان ہے کہ مجھے اس کا اجر ضرور ملے گا.. ہاں ان میں سے کچھ ازبک یا تاجک وغیرہ مسلمان بھی ہو چکی ہیں لیکن وہ نام کی مسلمان ہوتی ہیں، مجال ہے ان میں کوئی ایک بھی نماز روزے کی پابند ہو..محض نام کی مسلمان ہوتی ہیں تو انہیں سپلائی کر دینے میں بھی کچھ حرج نہیں..(۴)

مارکسی تعلیمات پر یقین رکھنے والے افراد اپنے وطن چھوڑ کر سوویت یونین کا حصہ بنتے ہیں۔ جب کمیونسٹ مرکز USSR ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے تو ان لوگوں کے خواب بھی بری طرح بکھر جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سرمایہ دارانہ نظام میں زندگی گزارتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں کیونکہ اشتراکی سماج میں جو چیزیں ان کے اختیار میں نہیں تھیں اب مکمل طور پر اس کے مالک بن گئے ہیں۔ ہر اشتراکی سماج میں جو چیزیں لائن میں سب کو ملتی تھیں اب سرمایہ دارانہ نظام میں شیشوں میں بند مہنگے داموں میں خوب صورت پیکنگ میں مل رہی ہے۔ ایسے میں کچھ کردار اس نئے سماج میں مزاحمت کا رویہ اپناتے ہیں لیکن نئے سماج (سرمایہ دارانہ نظام) کا پرچار ان مزاحمت کرنے والوں کے دوست کرتے ہیں۔ ظہیر الدین، قادر قریشی، وارث چوہدری، بورس اور اس کی بیٹی سویٹ لانا بھی ان میں شامل ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ظہیر الدین، گالینا بے کار پرزے ہو کر گھر میں بوجھ بن جاتے ہیں۔ اس طرح باقی کردار عارف نقوی، قالب، مصطفیٰ اسلام اب نئے نظام کو دیکھ کر اپنا ماضی یاد کرتے ہوئے ناسٹالجیا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے قاری محسوس کر سکتا ہے کہ مصنف نے اس المیے کو بیان کرتے ہوئے حقیقت نگاری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

اے غزالِ شب میں ظہیر الدین کو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہ اشتراکیت کا قائل ہے۔ ظہیر الدین کو زبردستی اس کی اپنی اولاد اور اس کے اپنے دو دوست سرمایہ دارانہ نظام کی خوبیاں اور ضرورت بیان کرتے ہیں بلکہ سرمایہ داری کے حق میں تبلیغ کرتے ہیں۔ ظہیر الدین اس نظام کو اپنانے سے کتراتا ہے۔ ظہیر الدین اس نئے نظام سے وقتی طور پر سمجھوتہ کر لیتا ہے چونکہ اس کی بیمار بیوی گالینا وہیل چیئر پر اور سویٹ لانا کافلموں میں جانا اس کی مجبوری ہے۔ بورس کی فرمائش، اور اپنی معاشی حالت تنگ دستی سے مجبور ہو کر وارث چوہدری

کے کہنے پر لینن کے مجسمے پگھلا کر گھر کی معاشی پوزیشن بہتر کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔ ناول میں اشترا کی نظام کا زوال اور ساتھ ساتھ سرمایہ داری نظام سے پیدا ہونے والے ظالمانہ رویے کو دکھایا گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے منفی اثرات سماج پر اشترا کی نظام زیادہ واضح بیان ہوئے ہیں۔ اے غـــزالِ شـــب میں کرداروں کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح ان کرداروں کا استحصال کیا گیا ہے؟ ان کا استحصال کون لوگ کر رہے تھے؟ حالات کے مارے لوگوں نے طبقاتی سماج، عدم مساوات، سماج کی معاشی ناہمواری اور جبر و استحصال کے خاتمے کے لیے غیر مساوی سماج مزدوروں کی سلطنت کے لیے عملی قربانیاں دیں۔ تا کہ آنے والی نسلیں اس طرح مسائل کا شکار نہ ہوں۔

ناول میں فلیش بیک کی تکنیک کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اے غـــزالِ شـــب میں مستنصر حسین نے شاعرانہ انداز میں اپنایا ہے جو کہ ناول کے موضوع سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ناول کے اندر کرداروں کے ذریعے اشعار کا سہارا لے کر مکالمے کی صورت ملتی ہے۔ یہی اُسلوب مصنف کے شعری ذوق کی طرف اشارہ ہے۔ اے غزالِ شب میں میں مصنف لکھتا ہے:

ے ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے(۵)

اسی طرح وہ نہ صرف اشعار کا استعمال کرتے ہیں بلکہ انہوں نے رواں نثری جملوں میں اشعار کے مصرعوں کا استعمال بھی کیا ہے مثلاً: ''جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا'' (۶)۔

ے قدم قدم پہ جنوں اختیار کرتے ہیں
شباب تھا تو ستارے شکار کرتے تھے(۷)

ے جنوں میں جتنی بھی گزری بہ کار گزری ہے
ے اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

اے غـــزالِ شـــب میں کہاوتوں کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے۔ ان کہاوتوں کی مدد سے قاری کو لمبی بحث سے مختصر واضح مفہوم سامنے آتا ہے۔ کہاوتیں موقع محل کے عین مطابق محسوس ہوتی ہیں۔ جس طرح ناول کا

عنوان کرداروں کی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتا ہے: ''اگر پیٹ میں نہ ہوں روٹیاں تو سبھی باتیں کھوٹیاں ...اور یہی تو ہے اشتراکیت کا فلسفہ..''(۸)۔ مزید لکھتا ہے: ''نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے''(۹)۔ ''میڈ ان چائنہ''(۱۰) کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ: ''شباب تھا تو ستارے شکار کرتے تھے''(۱۱)۔

اے غـــزالِ شـــب میں فلسفیانہ انداز کو مصنف نے بخوبی استعمال کیا ہے۔ یہ فلسفیانہ انداز قاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے جب کردار فلسفیانہ گفتگو کرتے ہیں۔ ناول میں یوں ذکر ہوتا ہے: ''سوگ اور ماتم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ظہیر..نظام کی تبدیلی کو سولہ برس ہونے کو ہیں تم ابھی تک سیاہ لباس میں ہو...''(۱۲) نیز ایک اور جگہ یوں ذکر ہوتا ہے: ''ماضی کا مجرم ہونا بھی بہت اذیت ناک ہے۔''(۱۳)

مستنصر حسین تارڑ نے انسانی جذبات کو اشعار اور کہاتوں میں بیان کیا ہے جس سے قاری کی دلچسپی بڑھتی ہے۔ اس طرح مصنف فلسفیانہ گفتگو کے ذریعے اپنے مدعا کو بیان کرتا ہے۔ ''یہ پھر سے وہی زمانے ہوئے جب ہر قدم پر جنوں اختیار ہوتا تھا''(۱۴)۔ دوسری جگہ اس کا اظہار یوں ہوا ہے: ''تو پھر تمہارے چہرے پر ایک آزردگی کیوں ایک سرسوں کے کھیت کی مانند پھیل رہی ہے۔''(۱۵)

> ناول میں پنجابی، سرائیکی اور اردو گانوں اور فلمی گیتوں کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں جس سے اُسلوب میں رنگینی پیدا ہو جاتی ہے جو قاری کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ مثلاً ''آوارہ ہوں، آوارہ ہوں''(۱۶)، ''لیلیٰ او لیلیٰ''(۱۷) وغیرہ۔ اسی طرح سرائیکی شاعری اور گانوں کا استعمال نظر آتا ہے، ''لنگھ آجا پتن، جھناں دا اویار''(۱۸) پنجابی شاعری کا استعمال بھی نظر آتا ہے ''اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے''(۱۹)

یہ ناول اشتراکی انقلاب روس اور انقلاب کے بعد سرمایہ داری کے ظہور کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ انقلاب روس تاریخ انسانی میں بالخصوص بیسویں اور اکیسویں صدی میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ زار شاہی کا تختہ الٹا دیا گیا اور انقلاب روس کے ذریعے پوری دنیا کو متبادل نظام دیا گیا۔ تیسری دنیا کے پسماندہ عوام کا ایک بڑا طبقہ انقلاب روس سے بے حد متاثر ہوا جس کا اظہار ناول میں کثرت سے ہوا ہے۔ یہ ناول سوویت یونین کے انہدام، پس ماندہ حالات کے مارے لوگوں کی ذہنی اور نفسیاتی سہارے کی امید دلانے والے اشتراکی نظریے کی شکست کے بعد نظریاتی

تبدیلیوں کی عکاسی کرتا ہے۔اور ساتھ یہ بھی کہ نئے روس میں اشتراکی کرداروں کو کس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ناول ایسے ہی کرداروں کا مجموعہ ہے جو اشتراکیت کے قائل ہیں بعد میں سرمایہ داری کے ظہور میں آنے کے بعد مزاحمت اور مفاہمت کو اپنا شعار بناتے ہیں۔

اے غزالِ شب ممکنہ طور پر اردو ادب میں پہلا ناول ہے جو اشتراکی نظریے کے اتار چڑھاؤ اور انہدام کے بعد اس نظریے سے وابستہ افراد کے حالات اور المیے کو مرکزی موضوع کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔اس ناول کو پڑھتے ہوئے بیسویں صدی کے انقلاب روس کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد کیسے انسانوں کی جگہ مشینوں نے لی۔سرمایہ دارانہ نظام نے دنیا کو دہشت گردی، عدم تحفظ اور عالمی دنیا کے توازن کو بہت نقصان پہنچایا۔سوویت یونین کے انہدام کے بعد دنیا کا توازن بگڑ گیا۔افغانستان میں سوویت یونین کی شکست ہی وہ جنگ تھی جس کے سبب سے سوویت یونین بکھر کے رہ گیا۔اس کے انہدام کے بعد لوگ دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی بنے لگے اور دوسری جانب ایسے لوگ بھی تھے جو سوویت یونین میں بادشاہ تھے، آزاد تھے، خوش حال تھے لیکن نئے روس (سرمایہ دارانہ روس) کے نئے نظام میں بھکاری ہو کر رہ گئے۔

ایک بڑی تعداد میں لوگ زندگی کی بنیادی ضروریات سے ہاتھ دھو بیٹھے۔سرمایہ دارانہ نظام نے انسانی کو اشیاء کے طور پر استعمال کیا اور پھر چھوڑ دیا۔سرمایہ دارانہ نظام میں عورت کی عزت نفس باقی نہیں رہی اس نظام میں مفاد کے علاوہ کوئی بھی اصول نہیں چلتا۔اپنی زندگی کو جنت بنانے کے لیے دوسروں کی زندگی کو عذاب بنانا سرمایہ داری کے اصول کا حصہ بن گیا۔سرمایہ دارانہ نظام کے غیر انسانی رویے پر تنقید ہمیشہ سے ہی ہوتی رہی ہے۔اور اس کے اثرات ناول اے غزالِ شب میں کثرت سے ملتی ہے۔

اے غزالِ شب میں انسانی رویوں کو بیان کرتے ہوئے تارڑ نے پاکستانی سماج اور روسی معاشرت کا نقشہ بخوبی پیش کیا ہے۔مصنف نے لاہور میں مزدوروں کی منڈی کا ذکر، مزدور چوک میں مزدوروں کا حصول رزق کے لیے قطار میں بیٹھنا اور گاہک کے آتے ہی گاڑی کی طرف دوڑنا، پاکستانی معاشرے میں آج بھی قدیم دور کی ناانصافیوں کی باقیات کو ظاہر کرتے ہیں۔مزدور خریدار کے سامنے اپنی محنت (جنس) پیش کرتا ہے، گڑگڑا کا مانگتا ہے۔مزدور کی عزت نفس برقرار نہیں رہتی۔ان کے چہروں پر بھوک اور گھر کے حالات کی تصویر عیاں ہوتی ہے لیکن ''بڑے لوگ'' بڑی گاڑیوں والے ان مزدوروں کو جانور سے کمتر سمجھتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار مذہب کو ایسے استعمال کرتا ہے کہ انسانی ہمدردی لیتا ہوا اپنی دولت بڑھاتا جاتا ہے۔ اخلاقیات اور سماجیات کو مدنظر رکھے بغیر اپنا فائدہ تلاش کرتا ہے۔ ناول میں اس کی عمدہ مثال قادر قریشی کا کردار ہے جو مذہب کا سہارا لے کر جنس کی منڈی کا کاروبار کرتا ہے اور اس کے ساتھ محفل نعت اور ہاتھوں میں تسبیح بھی رکھتا ہے۔

اے غزالِ شب میں ہجرت کا مسئلہ بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کردار پاکستان سے ہجرت کر کے دوسرے اشتراکی ممالک کی طرف چلے جاتے ہیں مگر ماضی اور یادوں کا سیلاب برابر ان کا پیچھا کرتا ہے۔ اس ناول میں ناول میں ماضی اور حال کا تقابل وموازنہ بیان ہوا ہے۔ ناول کے کردار واپس جب پاکستانی سماج میں آتے ہیں تو یہاں ہر چیز سے وہ واقف ہونے کے باوجود خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ اور وہاں سے بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ ناول میں ''جیپسی'' کے کردار کی بھی اس حوالے سے خاص اہمیت ہے۔ جیپسی پاکستان میں دیکھتی ہے کہ یہاں لوگ پارٹیوں میں شراب پینے کے بعد بدمست ہو جاتے ہیں۔ بڑے لوگ جیپسی کے گیت کے بجائے اس کے برہنہ جسم کو دیکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتا ہے:

> اور جب میں گٹار پر گیت گاتی ہوں تو ان کی توجہ میری رانوں پر ہوتی ہے، تانوں پر نہیں.. پھر وہ مجھ پر کرنسی نوٹوں کی بارش کر دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ پرفارمنس کے بعد میں انہیں سمیٹ لوں (۲۰)

یہی رویہ ''جینا اسلام'' کو بھی پاکستان سے دور لے جاتا ہے۔ ناول کے کرداروں کا آپس میں کوئی واضح خونی رشتہ وتعلق نہیں لیکن ایک خواب، ایک کشتی ہی کشتی کے مسافر، ایک ہی منزل کے متلاشی ان کے تعلق کی وجہ ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اس رشتے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ: ''نظریات اور خوابوں کا رشتہ بہت پرانا ہے'' (۲۱)۔

اے غزالِ شب میں کرداروں کا مکالماتی انداز اور مکالمے بہت گہرے معنی رکھتا ہے۔ جب ان کرداروں کے خواب کی تکمیل نہیں ہوتی تو یہ ناکامی کا الزام سرمایہ داروں پر اور اپنے شعراء پر لگاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس کا اظہار یوں کیا ہے:

> تمہیں پتہ ہے ہمارے اصل مجرم کون ہیں، جنہوں نے ہمارے ساتھ فریب کیا... ترقی پسند شاعر اور دانش ور... انہوں نے ہمیں خواب دکھلائے، انقلاب کے رومان کی آگ میں

زندہ جلا ڈالا..ہم تو نہ دیکھ سکے، نہ تاج اچھالے گئے نہ تخت گرائے گئے اور نہ ہی خلق خدا نے راج کیا..اور کیا چاند کو گل کریں تو جانیں..تو چاند بھی گل ہو گیا..(۲۲)

دوسری جگہ میں یہی کردار اپنی فریاد ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں:

دراصل زمانے نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا، اشتراکی رہنماؤں کی چال بازیوں کے آگے مات گئے..ہم جو بادشاہ تھے بساط پر جو کروں کے ہاتھوں پٹ گئے اور ان میں اشتراکیت کے علمبردار جو کر بھی تھے جنہوں نے ہماری آنکھوں میں نظریے دھول جھونکی کہ ہم ان کے ظلم وستم کے دفاع میں جت گئے..نظریے کی سچائی میں کوئی شک نہ تھا..ہاں جن کے ہاتھوں میں اس نظریئے کی تکمیل تھی وہ باوفا شعار نہ تھے اور یوں ہم سب اپنے بھولپن میں تاریک راہوں میں مارے گئے..تم دیکھ لو وہی نظریہ انیس بیس کے فرق کے ساتھ سکنڈے نیویا میں رائج ہے اور انہیں مثالی ریاستیں بناتا ہے..کیوبا کے لوگ..(۲۳)

ناول کا آغاز ظہیر الدین کے کردار سے ہوتا ہے۔اس کردار کے ساتھ باقی کردار ایک نظریئے کے قائل دکھائے دیتے ہیں۔ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے خواب ادھورے نہ رہ جائیں۔پورے ناول میں اشتراکیت کا خواب حقیقت میں بدلنے اور سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے کی کوشش میں دکھائی دیتے ہیں۔مصنف نے جہاں اشتراکیت کے انہدام کو بیان کیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی سرمایہ دارانہ نظام کا وحشیانہ چہرہ بھی دکھایا ہے کہ اس نظام سے وابستہ افراد نے اس فکر کو کیسے ناکام کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

ناول میں سرمایہ دارانہ نظام کے چنگل میں گرفتار ہوئے کرداروں کا ذکر ملتا ہے کہ کیسے یہ اس چمکتے ہوئے نظام میں گرفتار ہو گئے۔یہ اپنے مفاد کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں کیونکہ اس میں روحانیت اخلاقیت نہ ہونے کے برابر ہے۔کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو اس نظام کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں لیکن بعد میں پگھل جاتے ہیں۔اس پگھلاو کے بعد انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔وہ احساس جرم اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ناول میں وارث چوہدری کا کردار ان کی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔

اے غزالِ شب میں محرومیوں، عدم مساوات، اور حالات کے مارے لوگوں کا کرب بیان ہوا ہے۔ان لوگوں نے ہمیشہ اشتراکیت اور غیر طبقاتی سماج کے گیت گائے ہیں۔شاید ہمیں نہیں لیکن آنے والی نسل کو ایک غیر

طبقاتی سماج، عدم معاشی تقسیم اور جاگیرداری وسرمایہ داری سے نجات مل جائے۔اس زمین پر آقا اور غلام، حکمران اور رعایا کا نظام نہ ملے۔یہ روئے زمین پر ایک انسانی سماج چاہتے ہیں۔زیست کرنے کا یہی ڈھنگ اس کا فلسفہ اقتصادی مسائل سے آگہی کا نچوڑ ہے کیونکہ ہر نظریے میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔اس طرح سوویت یونین انسانی معاش اور معاشرے کے ترتیب، تنظیم وتقسیم کا ایک تجربہ تھا جو ناکامی یا کامیاب کے علاوہ دنیا کو ایک Simple مساوی سماج کا تصور پیش کرتا ہے۔ناول اے غزالِ شب میں اس اشتراکی نظام کا مکمل بیان موجود ہے۔

ب: اے غزالِ شب میں سقوط سوویت یونین کے بعد سرمایہ داری کا ظہور

اے غزالِ شب میں جہاں اشتراکیت کا ذکر ہوا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ سرمایہ داری پر بھی بات ہوئی ہے۔اے غزالِ شب ٹوٹے ہوئے خواب کا نوحہ اور اشتراکیت کے انہدام کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کا اظہار ہے۔سوویت یونین کے انہدام کے بعد سرمایہ داری کا خدا یزید کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا ہے۔ سرمایہ داری اور سرمایہ دار کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔سرمایہ دار مزدور کو جانور سمجھ کر استعمال کرنے کے بعد پھینک دیتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام میں ڈالر اور پیسے سے خواب دیکھے بغیر ان کی تعبیر خریدی جاسکتی ہے۔ان کے لیے وطن کو خیر آباد کہنا ضروری نہیں ہوتا۔کارل مارکس جو کہ ایک جرمن معیشت دان تھا اس نے مزدوروں کے حقوق کے لیے یہ نعرہ لگایا کہ:''دنیا بھر کے مزدورو!ایک ہو جاؤ''۔مزدور پر انحصار سرمایہ دار کا بھی ہوتا ہے مگر کوئی اور سرمایہ دار یہ نعرہ نہیں لگاتا۔سرمایہ دار یہ نعرہ اس لیے نہیں لگاتا کیونکہ سرمایہ داری کا اصول یہ رہا ہی نہیں کہ محنت اور سرمایے کی تخلیق کرنے والوں کا ان کا اتنا حق مل سکے کہ وہ سرمایہ دار کے برابر آجائیں۔آج سرمایہ داری میں کبھی اسٹاک ایکسچینج پر کھڑے یہ نعرہ نہیں لگایا جاسکتا کہ''دنیا بھر کے سرمایہ دارو!ایک ہو جاؤ''کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں صرف وہیں ایک ہوا جاتا ہے جہاں مفاد ہو۔اس لیے سرمایہ دارانہ نظام میں انسان دوسرے انسان کا دشمن بن جاتا ہے۔دولت میں اضافہ مقصد اشتراکی ہوتا ہے ذاتی ملکیت پر انحصار ہوتا ہے۔جبکہ اشتراکی معاشرہ تمام پہلوؤں سے مساوی سماج کا قائل رہا ہے۔سوویت یونین کے انہدام کے بعد دنیا ایک سرمایہ داری کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔سرمایہ دار اور سرمایہ دارانہ نظام نے ہمیشہ کی طرح ذاتی ملکیت کو فساد کی جڑ قرار دینے والوں کے خلاف پروپیگنڈے کئے۔اشتراکیت جیسی کتنی تحریکوں کو اپنے مداری کی طرح چکر میں ختم کردیا۔لیکن اے غزال شب میں مصنف نے نظریے کو شکست سے دوچار دکھایا ہے۔اشتراکیت ایک مساوی سماج کا حصول چاہتا ہے۔غیر طبقاتی سماج جس میں آقا، غلام، مزدور،

حکمران، کمزور اور طاقتور کی تقسیم کا خاتمہ چاہتا ہے۔

اے غزالِ شب میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد کرداروں کی نفسیات اور سرمایہ داری کا ظہور ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

> وہ زمانے جب دریائے ماسکو کے پانیوں پر ہمیشہ افق کی سرخی بچھی رہتی، کناروں پر پھیلے ہوئے برغ کے جنگلوں میں اس کے خواب دھند کی مانند ایک خمار میں تیرتے پھرتے..تب سوویت یونین حکومت کی جانب سے ایک خصوصی انقلابی ایشیائی فنڈ میں سے اسے ایک ماہانہ وظیفہ باقاعدگی سے پہنچ جاتا..اس کے سوا وہ ایک نامعلوم سے سرکاری محکمے میں نامعلوم سا اہلکار بھی تعینات تھا جس کی ذمہ داریاں بھی نامعلوم تھیں لیکن تنخواہ اتنی معقول تھی کہ جس سے بخوبی گزارہ ہوتا چلا جاتا..لیکن جونہی اتھل پتھل ہوئی..سوویت یونین کے طول وعرج میں واقع شہروں اور قصبوں کے چوکوں میں ایستادہ لینن کے لاکھوں مجسمے اوندھے ہو کر زمیں بوس ہونے لگے اور ان کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام کی فاحشہ پریاں براجمان ہونے لگیں تو نہ صرف اس کا ماہانہ وظیفہ منقطع ہوا بلکہ اس نامعلوم ملازمت سے بھی اسے جواب مل گیا..(۲۴)

اے غزالِ شب اردو ادب میں ایسا ناول ہے جو سوویت یونین کے انہدام کے بعد کی سماجی، سیاسی اور نظریاتی تبدیلیوں کو بیان کرتا ہے۔ یہ کہانی فرد واحد کی کہانی نہیں بلکہ ایک بڑی تہذیب کی روداد ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے سوویت یونین کے حالات کا بیان کرتے ہوئے اس کے انہدام کے بعد کے حالات پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اشتراکیت جو سوویت یونین میں معاشی و سیاسی طور پر ناکام ہو جاتا ہے تو اشتراکی لوگ نئے نظام کے سامنے مد مقابل آتے لڑتے جدوجہد کرتے ہیں تو کچھ کردار اس نئے نظام (سرمایہ دارانہ نظام) سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے گالینا کے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سوویت یونین میں صنعتی اور فضائی ترقی کی دوڑ میں چیزیں آسان سہی لیکن عام عوام سے دور رہتی تھیں۔ کیونکہ عام لوگوں کو قطار میں کھڑے ہو کر انتظار کرتے جبکہ گالینا جیسے مخصوص افراد تک وہ چیزیں مثلاً جراب وغیرہ مشکل سے پہنچ پاتی تھیں۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد گالینا کے سٹور کے قریب ایک نئی بین الاقوامی مارکیٹ تعمیر ہو چکی ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی اشتراکیت پر برتری کا

اشارہ دیتی ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کا خداوقت کے یزید کی صورت میں سامنے آیا۔مہنگے داموں میں ایک عام فرد کے بس سے باہر چیزیں دوکانوں پر موجود ہو کر غریبوں کا منہ چڑھانے لگیں۔

ان حالات وواقعات کو مستنصر حسین تارڑ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

بورس کی پیدائش کے فوراً بعد گالینا کو تب کے دنیا کے سب سے بڑے ستور گم میں ایک سیلز گرل کے طور پر ملازمت مل گئی تھی جو کہ ایک حکمران اعزاز تھا..وہ صرف ایک سیلز گرل نہ تھی بلکہ ایک ان داتا تھی جس کے قدموں میں روسی ضرورت مند پڑیت، منت سماجت کرتے تھے کہ تمام تر صنعتی اور خلائی ترقی کے باوجود سوویت یونین میں روزمرہ کے استعمال کے اشیاء کی شدید قلت تھی..ایک ٹیلی ویژن کا حصول چاہے وہ انتہائی بھدی اور ابتدائی ساخت کا ہو..تقریباً ایک معجزہ تھا..ایک اونی کوٹ..چند جرابوں اور جوتوں کے ایک جوڑے..یہاں تک کہ ایک ٹائی کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت مندوں کی قطاریں لینن کے مقبرے تک چلی جاتیں..اب یہ گالینا پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ ان سینکڑوں خواہش مندوں میں سے کن دو چار درجن لوگوں کی خواہش پوری کر سکتی تھی..کبھی کبھار وہ کاونٹر کے نیچے سے کچھ نذرانے قبول کر کے کسی حاجت مند پر کرم کر دیتی اور اضافی آمدنی بھی ان کے مناسب گزارے کا سبب بنتی..سوویت یونین کے ڈھے جانے سے گالینا کی یہ بادشاہت بھی ڈھے گئی..اس کے کاؤنٹر پر روزانہ جتنی بھی اونی کوٹ، جرابیں، جوتے اور ملبوسات آتے وہ پڑے رہتے، فروخت نہ ہو سکتے کہ نئے نظام کے تحت ان کی قیمتیں ایک عام شہری کی گرفت میں سے نکل کر عرشوں تک جا پہنچی تھیں..اس کے علاوہ گم سٹور کی سرخ عمارت کے عقب میں ایک انٹرنیشنل مارکیٹ وجود میں آ چکی تھی جہاں دنیا بھر کے مہنگے ترین ڈیزائنر ملبوسات، گھڑیاں، اوورکوٹ، پین، ہینڈ بیگ، سگریٹ لائٹر اور زیر جامہ وغیرہ برائے فروخت تھے..اور چونکہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ارب پتی اب ماسکو میں تھے اور وہ بھی بے دریغ اپنی وہ دولت جو انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی برکتوں سے شب بھر میں حاصل کی تھی، وہاں لٹاتے تھے..تو گالینا کے کاؤنٹر کی جانب کون دھیان کرتا..اس کے ہاں جو مقامی ساخت

کے زیر جامہ برائے فروخت تھے، ان سے تو ماسکو کی معمول خواتین کے سینے اور اندرون چھلتے تھے..(۲۵)

اے غزالِ شب سقوط سوویت یونین کے انہدام کے بعد کا نوحہ محسوس ہوتا ہے کہ روسی انقلاب اور اس کے بعد آنے والے ردانقلاب کے بعد جو ماحول سامنے آتا ہے اس میں عجیب وغریب صورت حالات پیش آئی۔ نئے نظام کے بدلنے سے جو بھکاری تھے وہ روس کے بادشاہ اور حکمران بن گئے جبکہ بادشاہ جن لوگوں کو دعوت نامے بھیجتے تھے، جو محفلوں میں دعوت پر مہمان خصوصی ہوا کرتے تھے۔ جواب ''غیر ملکی سور کے بچے، حرام زادے'' ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کے نظریات کو کوڑے دان میں پھینک دیا گیا۔ یہاں مستنصر حسین تارڑ نئے نظام کے وحشیانہ رویے پر تنقید کی ہے۔ سرمایہ داری سے جس قدر عالمی دنیا کو نقصان پہنچا ہے اس کا احساس بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ ہو رہا ہے۔ دنیا ادب اور پوری دنیا کو اخلاقی اور مالی نقصان کی صورت میں سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ دنیا بھر کی طاقت کا توازن بگڑ گیا ہے اور دنیا فحاشی، جنس پرستی اور انسان کا دشمن انسان بن گیا کی شکل میں نمودار ہو رہی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> جب کبھی کوئی عظیم تہذیب زوال پذیر ہوتی ہے..ایک نظام سرنگوں ہوتا ہے، ناکارہ اور بیکار ہو کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے تو اس تہذیب اور نظام کے جتنے بھی کل پرزے ہوتے ہیں ان کے سوا جو گرگٹ کی مانند رنگ بدلتے ہیں، وہ سب بھی ناکارہ اور بیکار ہو جاتے ہیں، اور ان کی جگہ نئے لوگ آجاتے ہیں..(۲۶)

زار شاہی کا تختہ الٹتے ہی چرچ کی تمام تر باقیات کو ختم کر دیا گیا تھا کیونکہ زار شاہی کے حکمران چرچ کے ذریعے مزدوروں پر ظلم کرتے رہے۔ مذہب کی آڑ میں اپنے احکام کو نافذ کرتے رہے مگر انقلاب نے اس مذہب کو جو کہ آلے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا اجتماعی طور پر ختم کر دیا اور اسے انفرادتک محدود کر دیا۔ ردانقلاب کے بعد سرمایہ داران باقیات کی صورت میں سرمایہ داری کرتے ہوئے کلیسا کے میناران سمیت، مارکس، اینگلز اور لینن کے مجسموں کو پگھلا کر ان پر بھی سرمایہ داری کرنے لگے۔ یہ کرب ناقابل برداشت ہوتا ہے کہ جن مجسموں کی ساری زندگی عبادت کرتے رہے آج ان کے سامنے نہ صرف گرایا جاتا ہے بلکہ خود ان کو پگھلانے کا ٹھیکا بھی لیا جاتا ہے۔ ناول میں مارکسی کرداروں کا یہ فعل اور ان کے خیالات یوں بیان ہوئے ہیں:

کمیونزم کے مقدس باپ کے مجسموں کو ڈھال کر ان کی صلیبیں بنیں گی..کامریڈ لینن پر کیا گزرے گی کیا اس کا سرخ چوک کے مقبرے میں حنوط شدہ بدن اپنے شیشے کے صندوق میں ایک کروٹ نہ بدلے گا..(۲۷)

اس قسم کے خیالات کا اظہار مزید ان الفاظ میں کرتا ہے:

تاریخ کا یہ کیسا بھیانک قہقہہ تھا کہ مذہب کو افیون قرار دینے والے لینن کے مجسموں سے ساختہ صلیبیں کلیساؤں میں آویزاں ہوں گی۔(۲۸)

اشتراکیت کا کرب اور سرمایہ دارانہ نظام کی وحشت کا بیان ظہیر الدین کے کردار کے ذریعے ہوتا ہے جب وارث چوہدری لینن کے مجسمے کا ٹھیکہ دیتا ہے تو یہ اس کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے:

میرے باپ شمس الدین انقلابی کے کواٹر کی دیواروں پر..مارکس اور اینگلز کے علاوہ نمایاں ترین تصویریں لینن کی تھیں جن کے ساتھ..ان کے زیر سایہ میں نے اپنا بچپن گزارا ہے..وہ نظریاتی خدا تھے تو کیا ان میں سے ایک خدا میں فروخت کرنے والا ہو جاؤں..(۲۹)

ظہیر الدین لینن کے مجسموں سے صلیب کو بنتا دیکھ کر بے حد بے چینی اور تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ان سے کلام کرتا ہے کہ کیسا وقت آیا ہے کہ مجھے اپنے ان نظریاتی خداؤں کو فروخت کرنا پڑ رہا ہے گالینا وہیل چیئر پر ہے تو ایسے میں بہاؤ کی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟اس کا جواب ناول میں کچھ یوں ملتا ہے:

ساری دنیا بہاؤ میں ہے،تم بھی بہہ جاؤ

''میں بھی؟''

''ہاں کیوں نہیں..تم بھی..''(۳۰)

اشتراکیت کے انہدام کے بعد نئے نظام سے زیادہ خطرناک اثرات سماج پر مرتب ہونے کا خدشہ ناول میں ظاہر کیا گیا ہے۔بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ مصنف نے نئے نظام سرمایہ دارانی نظام پر کڑی تنقید بھی کی ہے۔دنیا میں معاشی اور اخلاقی اقدار کا زوال جمہوری روس میں نمایاں رہا۔ماسکو میں ایک پاکستانی کردار قادر قریشی کا بیان اس نئے بدلتے وقت کے ساتھ خود کو تبدیل کرنے کے حوالے سے یوں ملتا ہے:

ان میں سے ایک نہایت مدبر شکل کی امیدوار نے قادر قاسمی کے سامنے اپنا کیس پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ سر..میں پہلے اپنا ذہن فروخت کرتی تھی اور اب اپنا بدن بیچنا چاہتی ہوں اور یہ یقیناً نسبتاً ایک آسان مرحلہ ہوگا کہ ذہن سوال کرسکتا ہے جب کہ بدن لب بستہ رہتا ہے..(۳۱)

ناول پڑھتے ہوئے انہدام کے بعد کے کرداروں کے رویے کی شدت کو محسوس کیا جاسکتا ہے کہ سرمایہ داری کے بعد نظریاتی افراد کا وجود ایک انسانی گوشت کے مانند استعمال کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔نظریاتی افراد کی زندگیاں اجیرن ہو جاتی ہیں یہ نظریاتی کردار اپنا تن،جسم منڈیوں میں فروخت کرتے نظر آتے ہیں۔ان میں سے کالج یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی اسکالرز بھی ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ دیگر کردار جمہوری روس میں متنازعہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ناول میں ان کے خیالات کا اظہار یوں ہوا ہے:

''حرامی غیر ملکی..ہماری عورتوں کو خراب کرنے والے..گو بیک..تم سؤر..غیر ملکی..''۔۔۔''
ظاہیر..میں نے تمہیں خبردار کیا تھا..تم اب سوویت یونین میں نہیں ہو..ایک آزاد جمہوری روس میں ہو..میں نے تمہیں خبردار کیا تھا..''(۳۲)

سرمایہ دارانہ نظام میں دولت پر چند افراد کا غلبہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے معاشی عدم دستیابی عین ممکن ہو جاتی ہے۔سرمایہ داری کا موثر ہتھیار ریاست اور مذہب ہی رہا ہے۔سوویت یونین کے انہدام کے بعد چند گروہ ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہو کر غالب آ گئے تھے۔جو اشتراکی نظام (سوویت یونین) میں بھکاری تھے لیکن انہدام کے بعد نئے نظام کے بادشاہ بن کر سامنے آ گئے۔مستنصر حسین تارڑ نے اس المیے کے لیے ان الفاظ کو استعمال کیا ہے:''سوویت یونین کے منتشر ہونے کے بعد یہاں ممکنات کی گنگا بہنے لگی تھی۔''(۳۳)

اے غزالِ شب کمیونزم کی تاریخ کا خاکہ بھی ہے اور اس کے عروج و زوال کی کہانی بھی۔یہ کرداروں کی داستان سے زیادہ ایک بڑی تہذیب کی کتھا ہے۔اے غزالِ شب ایک سیاسی تغیرات،معاشی انقلاب اور تاریخی تجربے کا اظہار ہے۔

ڈاکٹر سفیر اعوان اپنے مضمون (''اے غزالِ شب''اشتراکیت کا نوحہ) میں لکھتا ہے:

مستنصر حسین تارڑ کا نیا ناول ''اے غزالِ شب'' (۲۰۱۳ء) اردو ادب میں غالباً اپنی نوعیت کا واحد ناول ہے جو سوویت یونین کے ٹوٹنے اور غریب ممالک میں بیشمار لوگوں کو معاشی خوشحالی اور نفسیاتی سہارے کی آمد دلانے والے ثقافتی اور نظریاتی تبدیلیوں کی عکاسی کرتا ہے۔(۳۴)

اے غزالِ شب میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد کے حالات کا بیان ہے کہ اشتراکی نظام کے بدلے میں سرمایہ دارانہ نظام میں سارا جھکاؤ ایک طرف کو ہو گیا۔ کارخانہ دار اور مزدوروں میں وہی نفرت و عداوت پیدا ہو گئی جو کبھی آقا اور غلام میں ہوا کرتی تھی۔ پھر مضارع اور جاگیردار میں شروع ہو گئی اور اب سرمایہ دار اور مزدور کے مابین یہ آویزش جاری ہے۔ اس وجہ سے سرمایہ دارانہ ممالک میں خلفشار و انتشار بڑھ گیا ہے۔ سرمایہ دار آج بھی جدید صنعتی معاشرے میں زرعی معاشرے کی پرانی اور فرسودہ استحصالی قدریں باقی و بحال رکھنے پر بضد ہیں۔ جن سے ان کا معاشرہ تضادات کا شکار ہو کر تنزل پذیر ہو گیا ہے۔ سرمایہ دار اور سرمایہ دارانہ نظام میں منافع خوری کے حوالے سے کوئی اخلاقی اور سماجی اقدار معانی نہیں رکھتیں۔ ایسے لوگ قادر قریشی کے کردار کی صورت میں نظر آتے ہیں جن کے لیے ہر قسم کی جائز و ناجائز سرگرمیوں کو خود کو مصروف رکھنا ضروری ہے۔ اس کردار کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہے کہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد پڑھی لکھی روسی عوام کا کیا حال ہوا؟ باشعور افراد ذہن کے بجائے جسم فروخت کرنے پر آ گئے۔ لیکن ڈیلر کا کردار پاکستانی کردار مذہب کی آڑ میں یہی سب کچھ کرتا رہا، بلکہ اپنے پیشے پر فخر کرتا ہوا یہ رائے رکھتا ہے کہ روزِ محشر اس کا اجر ضرور ملے گا۔ ناول میں اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے:

> یہ سب جنہیں میں برآمد کرتا ہوں کفار کی بیٹیاں ہیں.. ایک طرح سے کنیزیں ہیں، مال غنیمت ہیں تو ان کا کاروبار عین شرعی ہے بلکہ سچ پوچھو تو میرا ایمان ہے کہ مجھے اس کا اجر ضرور ملے گا..(۳۵)

یونین کے انہدام کے بعد جنم لینے والے حالات کا بیان واضح الفاظ میں ملتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں منافع خوری کے سوا کوئی علمی و اخلاقی قدر ملحوظ خاطر نہیں رکھی جاتی۔ اس وحشیانہ نظام نے دنیا کو جنس پرستی اور دہشت گردی کے ساتھ غیر یقینی صورت حال اور انسان دشمن بنا دیا ہے۔ مصنف نے ناول میں پاکستانی سماج اور روسی کرداروں کا کرب محاشی اور کلب کلچر کے اثرات کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

ظہیرالدین نور جہاں، زبیدہ خانم کے گانے سننا چاہتا ہے لیکن کیسٹ تلاش کرتے ہوئے اسے ایک سی ڈی ملتی ہے۔ جسے دیکھتے ہی وہ حواس کھو بیٹھتا ہو کیونکہ اس کی بیٹی اور انقلاب کے سرگرم سپاہی شمس الدین کی پوتی برہنہ حالت میں ایک سگار پھونکتے ہوئے روسی کے سامنے اٹھلاتی، نخرے دکھاتی قائل اور مائل کرنے والی حرکتیں کرتی ہے۔ یہاں سرمایہ داری کے ہاتھوں مجبوری کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح لوگ اپنی بقا کے لیے زندگی سے لڑتے جدوجہد کرتے ہیں۔ بجائے شرمندگی کے وہ اس پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ ''میں ایک ماڈل گرل ہوں اس میں کیا حرج ہے۔ اگر میں یہ کچھ نہ کروں تو بیمار ماں کا علاج کیسے ممکن ہے؟ معذور بورس کا کیا؟ گھر کے اخراجات کا کیا ہو گا؟'' ان حالات سے مجبور ہو کر لوگ سماجی اقدار کی فکر کیے بغیر اپنی جنس کو کم داموں سرمایہ دار کو فروخت کر دیتے ہیں۔ سرمایہ دار مزدور سے کام لینے کے بعد اسے جانور سے بھی کمتر و بدتر سمجھتا ہے۔ یہی تضاد تاریخ انسانی میں انقلابات کا سبب بنتا رہا ہے۔ ناول میں مستنصر حسین تارڑ ان حالات و مسائل کو یوں بیان کرتے ہیں:

> یہ محض تجسس تھا کہ میری بیٹی کی پسند کیا ہے کہ وہ ہر ڈی وی ڈی کو پلیئر میں دھکیل کر اسے ٹیلی ویژن سکرین پر دلچسپی سے دیکھتا کہ اس میں کیا ہے.. امیکی فلمیں، شیکسپیئر کے ڈرامے، کچھ اطالوی آپرا، براڈوے کے ہٹ کھیل اور تب ایک اور ڈی وی ڈی میں مقفل کچھ منظر سکرین پر حرکت میں آئے اور اس کا دل رک گیا.. سانس رک گیا، وہ فالج زدہ سا ہو گیا.. سکرین پر اس کی سویٹ لاتھی، برہنہ حالت میں، ایک سگار پھونکتے درمیانی عمر کے فربہ روسی کے سامنے اٹھلاتی نخرے دکھاتی، حرکت کرتی.. شمس الدین انقلابی کی پوتی اور اس کی بیٹی سویٹ لانا..
>
> سویٹ لانا نے شرمندہ تو خیر کیا ہونا تھا وہ الٹا اس پر برس پڑی ''ڈیڈی میری ذاتی سی ڈی تھی، آپ نے مجھ سے اجازت لیے بغیر اسے کیوں ڈی وی ڈی پلیئر میں داخل کیا.. آپ ایک غیر اخلاقی حرکت کے مرتکب ہوئے ہیں اور پھر آپ معترض بھی ہوتے ہیں.. میں ایک اداکارہ ہوں اور میں نے محض ایک ماڈل کے طور پر اپنے بدن کی نمائش کی ہے.. اس میں کچھ حرج ہے؟ ویسے میں اگر اس نوعیت کے پراجیکٹ قبول نہ کروں تو.. میری تقریباً اپاہج ہو چکی ماں.. نکمے اور ناکارہ بھائی بورس اور ڈیڈی آپ کا گزارہ کیسے ہو.. گھر کے اخراجات کے لیے

رقم کہاں سے آئے گی..(۳۶)

اے غزالِ شب میں ظہیرالدین، وارث چوہدری اور دیگر کرداروں کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ایک پرکشش نظام سہی لیکن اس نظام کے نقصانات اور بھی گمبھیر ہیں۔اس نظام کے خلاف مزاحمتی رویہ دنیا بھر کے مارکسی کرداروں نے کیا ہے کیونکہ وہ اس وحشیانہ نظام میں نہیں ڈھل سکے حالانکہ سامراجی قوتوں نے مختلف حربے استعمال کیے چونکہ طبقاتی نظام کے خلاف اعلان جنگ نہیں ہوتا۔یہ ایک کرب کا بیان ہے دکھے دلوں کی فریاد کا بیان ہے۔ایک مارکسی نظریات کا حامل کردار ظہیرالدین ناول میں کثرت سے مارکس، اینگلز اور لینن کے ارشادات کو ہی زندگی کی آخری تفسیر سمجھ کر فنا ہونے کا جذبہ رکھتا ہے۔بدلتے حالات واقعات کے ساتھ بدلنا انسان کی فطرت ہوسکتی ہے۔انسان کسی بھی نظریے کے بغیر جی نہیں سکتا۔انسان کو نظریے کی نفسیاتی بھوک رہتی ہے خصوصاً فکر سے متعلق۔ایسے میں مفاہمت کے ساتھ نیا نظام کا تاریخی جبر ہوسکتا ہے لیکن سمجھوتہ نہیں۔نظریاتی کرداروں کا وقتی طور پر بہہ جانا ایک فطری یا جبری عمل تھا لیکن ایک احساس گناہ کو لیے ان کا زندگی گزارنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ایسا ہی کردار وارث چوہدری جو کہ سرمایہ دارانہ نظام میں خوش حال زندگی گزار رہا ہے لیکن ظہیرالدین کے جانے کے بعد اپنی قید کا بوجھ محسوس کرتا ہے۔اپنی شیش محل جیسی کوٹھی میں مارکس، اینگلز اور لینن کے ارشادات کو یاد کرتا ہوا ظہیرالدین کو کہتا ہے کہ آپ آزاد ہوگئے ہیں۔اس وحشیانہ نظام میں طوائف بن کر رہ گئے ہیں۔

کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈے ہوتے رہے۔برطانیہ کالونی نے ہر ممکن کوشش کے ذریعے سوویت یونین کو ناکام کرانے کے لیے مختلف طریقے آزمائے لیکن پھر بھی یہ نظام ستر سال تک چلتا رہا۔اتحادی قومیں سوویت یونین کے اندر گورباچوف کے معاشی اصلاحات سے اور سٹائل کی سخت آمریت سے تنگ ہو کر علیحدگی پر آمادہ ہوگئی تھیں۔لیکن اس علیحدگی سے یہ اخذ کر لینا کہ نظریہ ختم ہوگیا فاش غلطی ہے۔یہ رویہ علمی نہیں بلکہ شدت پسندی کا اظہار اور کم علمی پر مبنی ہے۔کیونکہ کمیونزم ایک احساس کا نام بھی ہے۔جہاں کہیں معاشی ناہمواریاں اور ظلم و جبر کا اثر ہوگا وہاں سے کمیونزم کی آواز بلند ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔

اے غزالِ شب میں ظہیرالدین لینن کے مجسموں کو پگھلانے کے بعد آسائش مند خوش حال زندگی گزارتے ہوئے نئے نظام (سرمایہ دارانہ نظام) میں خود کو بالکل ناکارہ اور بوجھ سمجھتا ہے۔وہ محسوس کرتا ہے کہ اب خاندان اور اس سماج کو اشتراکی فلسفے، نظریے اور میری کوئی ضرورت نہیں۔اس کے ان خیالات کا اظہار ناول میں

اس طرح کیا گیا ہے:

> وہ ایک بجھ چکا دیا تھا جس میں روشنی بکھیرنے کے لیے نظریات کے تیل کی ایک بوند بھی نہ بچی تھی..اسے کب کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ اس نئے نظام میں لینن کے مجسموں کی مانند متروک اور بیکار ہو چکا ہے۔ نہ تو اس نظام کو اور نہ ہی اس کے خاندان کو اس کی ضرورت رہی تھی..وہ ایک استعمال شدہ کنڈوم کی مانند ناکارہ ہو چکا تھا۔۔(۳۷)

اے غزالِ شب میں جہاں اشتراکیت کا ذکر ہوا وہاں ساتھ ہی سرمایہ داری پر بھی بات ہوئی ہے۔ بلکہ دونوں نظاموں پر بات کرتے ہوئے دنیائے ادب پر ان دونوں نظاموں کے اثرات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے انہدام کے بعد علمی دنیا کو جو نقصان ہوا یوں محسوس ہوتا ہے کہ اے غزال شب میں اس پر نوحہ وگریہ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ روسی پڑھی لکھی خواتین جسم فروشی کی حد تک جا پہنچی تھیں۔ سماجی، اخلاقی اقدار کا رونا ایک روگ بنتا گیا۔ دوسری طرف اشتراکی انقلاب میں معاشی تنگی اور آمریت کو نشانہ بناتے ہوئے وہاں لوگوں کی نفسیات کو دکھایا گیا ہے۔ بغیر جدوجہد کے کیسے سوشلسٹ اتحاد بلاک علیحدہ ہوا؟ اس نئے نظام (سرمایہ دارانہ نظام) کے سامنے بہت سے فکری لوگ ڈھل گئے۔ لیکن شاید یہ تاریخی جبر کا ثبوت ہوں۔ کیونکہ ناول میں آسودگی ملتے ہی مارکسی کردار احساس گناہ کو محسوس کرنے لگے اور آرام دہ زندگی چھوڑنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ نئے نظام سے سمجھوتے پر ان کی اولاد خوشی سے راضی ہو جاتی ہے لیکن یہ سمجھوتہ نہیں بلکہ حالات وواقعات کے جبر کا نتیجہ ہے۔ ناول میں اس قسم کے حالات کا بیان یوں ملتا ہے:

> حالات بدل چکے تھے..اور اب نسبتاً بڑے فلیٹ میں منتقل ہو چکے تھے جس میں ایک نہیں اکٹھے تین غسل خانے تھے اور ان کے نلوں میں بھاپ چھوڑتا گرم پانی مسلسل برآمد ہوتا تھا اور کھڑکیوں کے نیچے دریائے ماسکو بہتا تھا اور اس میں رواں سٹیمروں کے بھونپائی سنائی دیتے تھے..گالینا اپنی جرمنی سے درآمد شدہ نئی نکور فلی آٹو میٹک وہیل چیئر میں متحرک ہوتی ہوئی پھرتی اور وہ دن گئے جب گالینا بڑبڑاتی مخمور حالت میں اپنے خاوند کو کوسا کرتی تھی اور ایک ہی پیرہن میں گزر اوقات کرتی تھی..وہ اب آئے دن اپنے لباس بدلتی رہتی تھی جو بے شک ''میڈان چائنہ'' تھے لیکن ان کے لیبل فرانس اور امریکہ کے مشہور عالم فیشن ہاؤسز کے

پر توقیر ناموں سے مرصع تھے..سویٹ لانا کی بدتمیزی بھی رخصت ہو چکی تھی اور وہ نہ صرف اپنے باپ کے ساتھ الفت سے پیش آنے لگی تھی بلکہ فلیٹ سے باہر جاتے اور پھر واپس آتے اس کے رخساروں پر ''آئی لو یو ڈیڈی'' کا بوسہ ثبت کرنا نہ بھولتی کہ ڈیڈی..فرسودہ، ناکارہ برسوں سے ایک بیکار وجود یکدم ہوش میں آ گئے تھے..انہوں نے اپنے انقلاب کے احمقانہ خوابوں میں گم رہنے کی بجائے پہلی بار زمینی حقیقتوں کا سامنا کیا تھا اور اپنے دوست وارث چوہدری کی منت سماجت پر کہیں شہر میں کامریڈ لینن کے مجسمے جو انہی کی مانند ایک عرصے سے بیکار پڑے تھے، انہیں ڈھال کر نئی نکور صلیبوں میں منتقل کرنے کا کاروبار کرنے لگے تھے اور مانگ پوری نہ ہوتی تھی..(۳۸)

خالد فتح محمد اپنے غزالِ شب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

یہ ناول بیک وقت دو براعظموں پر پھیلا ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ ایک بین الاقوامی سرد جنگ کو سامنے لا رہا ہے جس میں اس کے کردار نادانستہ طور پر اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اس جنگ میں شامل ہو جاتے ہین۔ یہ جنگ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان لڑی جا رہی ہے جس میں اشتراکیت کے سپاہی بددل ہو کر سرمایہ دار بن جاتے ہیں لیکن ان کے اندر کا اشتراکی ابھی تک زندہ ہے۔ وہ دولت کے انباروں پر اس مرغ کا طرح اکڑ کر کھڑے جائزہ لے رہے ہیں جو ایک روٹی کا بلاشرکتِ غیرے مالک ہو(۳۹)

اپنے غزالِ شب کے کرداروں کو دیکھا جائے تو حالات کا جبر معاشی ناہمواری کے سبب یہ کردار وطن چھوڑ کر نظریے کی بھوک کی خاطر اشتراکی ممالک کا حصہ بنتے ہیں۔

انسان ایک سماجی جانور ہونے کے ناطے سماج ترتیب دیتا ہے۔ قبیلے، خاندان، رشتے دار، برادریاں وجود میں لاتا ہے۔ سماج کو بہتر کرنے کے لیے قوانین وضوابط بنائے جاتے ہیں۔ یہ انسانی سماج رفتہ رفتہ تشکیل پاتا ہے اس سارے عمل میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ اس سارے سفر میں نئے اور بدلتے حالات میں نئے نظریات کی ضرورت پڑتی ہے لیکن کچھ لوگوں کے لیے بدلتے حالات کے ساتھ بدلنا ناقابل برداشت عمل بنتا ہے۔ یہ رجعت پسند پرانی اور فرسودہ روایات سے جڑ کر اپنی بقا چاہتے ہیں۔ یہی گروہ سمجھتے ہیں کہ تبدیلی کو قبول کرنے کا مطلب قدیم

نظریات کو کوڑے دان میں پھینکنے کے برابر ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ عہد حاضر کی ضرورت ہوتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں دانشور بدلتے تناظر میں انسانی فلاح کے لیے نئے نئے نظریات پیش کرتے آرہے ہیں۔ ایک ایسا ہی نظریہ ساز کارل مارکس بھی تھا جس کے مطابق کائنات کی ہر شے جدلیاتی مادیت سے دوچار ہے لہذا اس عمل کی صورت میں تضادات جنم لیتے ہیں یوں ارتقا کا پہیہ چلتا ہے۔ جدلیاتی مادیت کے فلسفے کا بانی ''ہیگل'' ہے لیکن کارل مارکس نے اس کو مختلف جہت عطا کی۔ یورپ کے صنعتی انقلاب نے سرمایہ دارانہ نظام کو جنم دیا اور طبقاتی سماج کو اپنے عروج پر پہنچا۔ ان سماجی حالات کو دیکھتے ہوئے اور طبقات کی کشمکش کو کم کرنے کے لیے غیر طبقاتی سماج کی ضرورت تھی۔ جہاں زندگی کے بنیادی وسائل تک ہر بنی نوع انسان کی رسائی ہو۔

انسانی محنت (جنس) کا معاوضہ، منافع میں برابر کی صورت میں ہونا چاہیے۔ منافع (مزدور کی محنت) سرمایہ دار کا بغیر کام کئے مزدور کا پسینہ جمع کرنا منافع کہلاتا ہے۔ ان معاشی تضادات کی صورت میں اکتوبر انقلاب ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب آیا۔ یہ ایک ایسی اشتراکی ریاست تھی جو نفع ونقصان اور نجی ملک و مفادات سے بالاتر تھی۔ اکتوبر انقلاب نے سوویت یونین میں تاریخی اعتبار سے پیداواری قوتوں کو کسی بھی ملک کے مقابلے میں بے مثال ترقی دی۔ انقلاب سے قبل پہلے زار شاہی روس زیادہ تر پسماندہ اور ناخواندہ عوام اور جاگیرداری پر مبنی تھا۔ انقلاب کے بعد دو دہائی کے قلیل عرصے میں روس نے طاقت ور صنعتی بنیادیں بنا کر صنعت کو ترقی دی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترویج نے پسماندگی کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ لیکن سوویت یونین کی ترقی سے سامراج اور برطانیہ کا لونی خوف زدہ تھی۔ پروپیگنڈے اور سرد جنگ کی صورت میں سوویت یونین کے اندر ہی اقتدار کی جنگ کو ہوا دے کر روس جنگی ترجیحات کے نتیجے میں انقلاب کا اصل مقصد پس پشت چلا گیا۔ اور روس سرماہی دارانہ پول کے شدید حملے کے نتیجے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سوویت یونین میں اظہار رائے کی آزادی نہ ہونے کے سبب ردعمل سامنے آیا۔ اسٹالن کی سخت فوجی آمریت کے سبب دانش مند طبقے نے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا۔

اے غزالِ شب سوویت یونین کے انہدام کے بعد سرمایہ داری کے اظہار کا نام ہے۔ سرمایہ داری ایک وحشت کی طرح ہوتی ہے۔ اس نظام میں فرد دوسرے فرد کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ کیونکہ فرد کو اپنے اپنے بارے میں ہی سوچنا پڑتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ممالک نے کمیونزم کے بہاؤ کو روکنے کے لیے اپنے ملکوں میں نچلے طبقات کو مراعات دینا شروع کرنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی معاشی تضاد موجود ہے۔ سرمایہ دار اور سرمایہ داری کا مقصد ذاتی منافع

نظریاتی اخلاقی سماجی اقدار ان کے سامنے کوئی وجود نہیں رکھتی ۔ سرمایہ داری دنیا کو طبقاتی نظام ہی مہیا کرتی ہے۔سرمایہ داروں نے مختلف حیلوں سے انسان اورانسانیت کواپنے جال میں پھنسایا ہے۔ایے غزال شب کے کرداروں کے ساتھ بھی ان واقعات وحالات کا سامنا کرنا پڑا۔

> بورس دیکھتے ہی دیکھتے اتنا خوشحال ہو گیا کہ اب وہ ارباط سٹریٹ کے داخلے پر اپنی سیاہ مرسڈیس سے اترتا..وہ ایک مناسب رقبے کا ڈاچا بھی خرید چکا تھا..اسے اپنے گمشدہ بازو کا کچھ غم نہ رہا کہ اگر یہ نہ بھی ہوتا تو وہ کبھی اتنا خوشحال نہ ہوتا..افغانستان کی جنگ کم از کم اس روسی کے لیے سودمند ثابت ہوئی تھی..(۴۰)

انسان طاقت،معیشت حاصل کرتے ہی دوسرے انسانوں پر زور آزمائی کرتا ہے۔ جب وہ طاقت ور ہوتا ہے تو اپنے کمزور پر، جب بااختیار ہوتا ہے تو بے اختیاروں پر، جب حاکم بنتا ہے تو محکموں پر، جب آقا بنتا ہے تو غلاموں پر، جب زمیندار تو مضارعوں پر اور جب کارخانہ دار ہوتا ہے تو مزدوروں پر اپنی طاقت اور معیشت کا اختیار قائم کرتا ہے۔ان حالات میں انسان جانور کی صورت ہو جاتا ہے۔خود بھی جانوروں کی طرح طاقت کا متلاشی رہتا ہے اور دوسرے کمزوروں کو بھی جانور سمجھ کر جانوروں جیسا سلوک کرتا ہے۔یہی رجحانات ہمیں تاریخ انسانی میں عہد جاگیرداری میں اور موجودہ دور کے سرمایہ دارانہ نظام میں مشاہدات کی روشنی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایے غزال شب میں انہدام کے بعد کس طرح سرمایہ دار نے لینن کے مجسموں اور مارکسی کرداروں کے ساتھ رویے برتا، یہ انسان کے مفاد بھرے رویے ہی ایک شکل ہے؟لیکن سرمایہ داری نے معاشی ترقی سے پوری دنیا کو اپنا غلام بنایا ۔انسان انسانوں سے دور ہوتا گیا۔ ایے غزال شب سرمایہ دارانہ نظام میں اشتراکیت کا سنہرا دور یاد کرتا رہتا ہے لیکن سرمایہ دار اور پیداواری رشتے ان کے نظریات کو اپنی ناآسودگی کا سبب بنتے ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام کا پرچار کرتے ہیں۔لینن کے مجسموں کے کاروبار کی طرف راغب کرتے ہیں۔

ظہیرالدین شمس الدین کا بیٹا ہے جو کہ ان تصاویر کی روشنی میں دیکھتا تھا ان ان کے مجسموں کو فروخت کر کے آسودگی کی زندگی گزارنے لگا۔ حالانکہ سرمایہ دارانہ نظام کسی قسم کی اخلاقی وسماجی اقدار کا پابند نہیں ہوتا تو ایسے میں کمیونزم کو برا بھلا کہا جاتا ہے لیکن ظہیرالدین وقتی طور پر مفاہمت کرتے ہوئے اپنے کرب کا اظہار یوں کرتا ہے:

> صرف وہی ایک مجسمہ نہیں،اس کی فوری فروخت کے بعد متعدد لینن وہاں آویزاں ہوئے

کہ امریکہ سیاح ان کے حصول کے لیے مرے جاتے تھے، منہ مانگی قیمت ڈالروں میں ادا کر کے انہیں جہازی سائز کے کریٹوں میں پیک کر کے بیک دقت ہوم شپ کر دیتے اور یوں کامریڈ لینن جس کا نظام جیتے جی تو ان ساحلوں کے نزدیک نہ آ سکا اب مردہ ہو کر مجسموں کی صورت میں زرد شیطان کے اس ملک امریکہ میں پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر داخل ہونے لگا..اسے عالیشان گھروں کے سوئمنگ پولز کے کناروں پر..وسیع گھریلو باغوں میں کہیں نواڈا اور کہیں فلوریڈا میں زیبائش کے طور پر ایستادہ کیا جانے لگا..ٹیکساس کے ایک کروڑ پتی نے اسے اپنی رہائش گاہ کے سدر دروازے کے باہر نصب کر کے اس کے سینے پر ایک تختی آویزاں کر دی ''یہاں کمیونزم اور کتوں کا داخلہ منع ہے..ایک چوکیدار کے طور پر میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں..از طرف ولاڈے میر لینن..''لاس ویگاس کے ایک قمار خانے کے باہر رنگین فواروں اور زرق برق روشنیوں میں وہ ایستادہ تھا اور تماش بینوں کو اندر آ کر جا کھیلنے اور طوائفوں کا ساتھ کھل کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا۔نیو یارک کی ایک بلند عمارت کی چھت پر وہ بازو پھیلائے کھڑا تھا ایک تضحیک آمیز زیبائش کی صورت..وہ جس نظام کے خلاف اسے ملیامیٹ کر دینے کی جدوجہد کرتا رہا تھا وہ اسی نظام میں اب ایک بیکار آرائش ہو چکا تھا..اور اس تہذیب یافتہ سرمایہ داری کی سلطنت میں بھی وہ اپنی ٹائی کی گرہ درست نہ کر سکا..وہ ڈھیلی اور بدوضع ہی رہی..(۴۱)

اے غزالِ شب کے پاکستانی کردار جو نیم صنعتی اور نیم جاگیردارانہ عہد سے تعلق رکھتے ہیں ایسے سماج میں طبقات کا ہونا عدم معاشی نظام اور دیگر ناہمواریوں کا ہونا فطری عمل بنتا ہے۔ناول میں تمام تر پاکستانی حالات و واقعات سے مجبور ہو کر سرخ سویرے کی خاطر مساوات، عدل اور مزدوروں کی سلطنت کا حصہ بنتے ہیں۔اے غزالِ شب کرداروں کی کہانی سے زیادہ تہذیبوں کا بیان ہے۔جاگیردارانہ نظام کی باقیات پاکستانی سماج میں رائج ہیں۔ جبکہ جاگیردارانہ نظام صدیوں پرانا دنیا میں رائج رہا ہے۔اس قدر پرانا نظام یک دم ختم نہیں ہو سکتا۔اس کے اثرات سماج میں لاشعوری طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔وہاں کے انسانوں کے رویوں میں اس کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ جاگیرداری کے بعد ایک وحشیانہ نظام سرمایہ دارانہ نظام جس کے مسائل سے دانشور مفکرین دنیا کو بتاتے رہے ہیں اے غزالِ شب اس نظام کے خلاف ایک طرح کے اظہار کا نام ہے۔اے غزالِ شب کے کرداروں پر

ناسٹالجیا کے عناصر زیادہ محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ مذکورہ کردار اشتراکیت کے انہدام کے بعد ان کی اپنی آبائی مٹی اور زمین بن جاتی ہے ان کی یادوں کا محور و مرکز بن جاتی ہے۔ ظہیر الدین اور مائی بوڑھی کا تعلق راقم کے مطابق اسی ناسٹالجیا کی طرف اشارہ ہے۔ ظہیر الدین کا تعلق بورے والا سے ہے اور مائی بوڑھی بورے والے کے ویرانے میں موجود آک کے کے پودوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ پودے ماسکو میں موجود نہیں اس کے باوجود ظہیر الدین کے لیے ان کی موجودہونا اس کے بچپن کی جا بن لوٹ کر جانے کی شدید خواہش کا اظہار ہے۔

ظہیر الدین نئے روسی نظام میں ''غیر ملکی، حرامی اور روسی عورتوں کی زندگی خراب کرنے'' کا الزام سہتا ہے۔ لیکن ظہیر الدین شمس الدین انقلابی کا بیٹا جو مارکس اور لینن کی تعلیمات میں پلا بڑھا، وہ کیسے ان حالات کا سامنا نہیں کرتا، لہذا ظہیر الدین آخر تک سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مزاحمت کرتا رہتا دکھایا گیا ہے۔

اے غزالِ شب میں کرداروں کو پاکستانی سماج اور اشتراکی ممالک کے میں دکھایا گیا ہے۔ انہدام کے تناظر میں دنیا کے توازن کا بگڑنا دکھایا گیا ہے جو کہ پہلے ایک توازن میں گل رہا تھا۔ اب یورپی دنیا پر بھی اس غیر متوازن نظام کے آثار سامنے آتے ہیں۔ انہدام کے بعد دنیا اخلاقی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی صورت حال میں توازن برقرار نہیں رکھ سکی۔ پاکستانی سماج میں لاہور جو کہ پاکستان کا دل مانا جاتا ہے، یہاں پر غریب عوام کا ہونا دور کی بات تھی اور اب تو اس کا پورا خاکہ و نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا گیا۔ پاکستانی سماج عالمی بدلتے حالات سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ اے غزالِ شب میں یوں ذکر کرتے ہیں:

> اسے محسوس ہوا کہ کبڑا اور بوڑھا ہو چکا کوچوان کچھ مزید جھک گیا ہے اور وہ سر ہلا کر بولا ''جناب والا.. کن زمانوں کی بات کرتے ہو.. مال روڈ پر تو ہم غریبوں کی کب کی چھٹی ہو چکی.. وہاں تو کاروں کو بھی رینگنے کے لیے جگہ نہیں ملتی، گھوڑے ٹانگے کا کیا کام.. لگتا ہے بہت زمانوں بعد لاہور آئے ہو۔ (۴۲)

اے غزالِ شب میں مستنصر حسین تارڑ مولویوں اور کمیونسٹوں کے اشتراکی (مشترک) خصوصیات کا بیان مکالمے کی صورت میں کراتے ہیں جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دونوں نظریاتی (Idealsit) ہوتے ہیں لیکن کمیونسٹ کردار اپنی وضاحت ایک منطقی صورت کرتے ہوئے واضح کرتا ہے کہ مساوات عدم کا نعرہ لگانے والے کم از کم اللہ اکبر کہہ کر کسی انسان کا سر نہیں کاٹ سکتے۔

ناول میں ان خیالات کا اظہار اس صورت ملتا ہے:

''طالبان کے ساتھ مل جائیں..''

''طالبان کے ساتھ؟''..مصطفے اسلام کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا..راوی کے کناروں پر براجمان اس راہب ظہیر الدین نے بھی دبے لفظوں میں طالبان کا ذکر کیا تھا..''کامریڈ.. حماقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..یہ لوگ صحیح معنوں میں مذہب کی افیون کے بیوپاری ہیں کہ یہ وسیع پیمانے پر گل لالہ کی کاشت کرتے ہیں،ان کے ڈوڈوں میں سے افیون کشید کر کے اسے ہیروئن کی سفیدی میں بدل کر اس سے حاصل کردہ رقم کو صرف کر کے اپنے تئیں جہاد کرتے ہیں تو کامریڈ صرف ایک گرم روٹی کی حدت محسوس کر کے اتنے تو نہ بولائے جاؤ''

''ہم بحث برائے بحث تو کر سکتے ہیں کہ نہیں..''

کیوں ہیں...

''کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ میں عارف نقوی..لکھنؤ کے سٹیج پر ایک انقلابی کرشن کیس مندر کے براہمن کی تنگ نظری کے سنگ چل سکتا ہوں لیکن..کچھ حقائق ہیں،جن سے ہم روگردانی اگر چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے''

مجھے از حد دلچسپی ہے ایسے حقائق سے..مصطفے اسلام مسکرانے لگا..پر عارف نقوی کے چہرے پر سے وہ شرمندہ اور معصوم مسکراہٹ سمٹ چکی تھی..

''ہم بھی تو ایک ایک نظام کی بوسیدگی کو درہم برہم کر کے بدلنے کی خاطر مسلح جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں..ریاستی مشینری کے ہر کل پرزے..فوج،بیوروکریسی،ملائیت کو ملیامیٹ کر کے.. اپنا ایک نظام نافذ کرنا چاہتے تھے اور ہم ماؤزے تنگ کے اس قول پر دل و جان سے ایمان رکھتے تھے کہ انقلاب کی نالی سے جنم لیتا ہے تو ہم میں اور ان میں کیا فرق ہے..صرف نظریات کا..''

کھڑکی کی سل پر دھری تینوں موم بتیوں کی جانب اگر تادیر دیکھا جاتا تو ایک لمحہ منکشف ہوتا جس میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سانس لے رہی ہوں..اپنی حیات کے یوں دھیرے

دھیرے پگھلنے کے خوف سے ان کے شعلے لرزیدہ ہوں..

''کامریڈ..''مصطفے السام بدستور مسکرا رہا تھا..''براہ کرم ہم کفار کو تو ان برگزیدہ حضرات کے ساتھ شامل نہ کیجیے جو بچیوں کے سکولوں کو بارود سے اُڑاتے ہیں، عورتوں کو برقعوں میں لپیٹ کر سرعام کوڑے لگاتے ہیں..چھوٹے بچوں کے ہاتھوں فوجیوں کو ذبح کرواتے ہوئے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہیں اور حجاموں کی دکانوں کو بموں سے مسمار کرتے ہیں.. داڑھیوں کو مٹھی میں بھینچ کر پارسائی کی رسید جاری کرتے ہیں..''

اورادھر عارف نقوی بدستور اسی متانت سے اپنی بات آگے بڑھانے کو بے چین تھا''کامریڈ ہم نے بھی تو اپنی مخصوص آئیڈیالوجی کو آخری سچ جانا..اس سے انکار کرنے والے یا مکمل طور پر ایمان نہ لانے والے لاکھوں لوگوں کو عقوبت خانون میں ڈال کر مردہ کیا..سائبریا کی برفوں میں اتنے لوگ دفن کئے کہ ان میں مزید تدفین کی گنجائش نہ رہی.. ہزاروں برسوں سے اپنی اپنی دھرتی پر آباد قومتیوں کو وہاں سے اکھاڑ کر کسی اجنبی ویرانے کی جانب دھکیل دیا تا کہ وہ مزاحمت نہ کر سکیں..چیچنیا کی پوری آبادی کو در بدر کیا..ہم بھی تو نظریاتی داڑھیاں ماپ کر فیصلہ کرتے تھے کہ کیا یہ مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے طے کردہ معیار پر پوری اترتی ہے..نہیں اترتی تو سنگار کر دو..تو پھر ہم میں اور ان میں کچھ فرق ہے کامریڈ..ہم اپنی علم و دانش میں اور وہ اپنی جاہلیت میں ایک ہی راستے پر چلے اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے..تو پھر..''

مصطفے اسلام رنجیدہ نہ ہوا بلکہ وہ اس بحث سے لطف اندوز ہو رہا تھا..وہ اور اس کی قبیل کے نظریاتی لوگ ہمیشہ کسی حد تک مجرم محسوس کرتے رہے کہ انقلاب اور مساوات وعدل کے نام پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے جا رہے ہین لیکن ان زمانوں میں وہ اسے سرمایہ دارانہ ملکوں کا پروپیگنڈا سمجھتے رہے اور اس میں مبالغہ بھی آخری حدوں کو چھوتا تھا اور جب انہیں حقائق کا علم ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی''ٹھیک ہے کامریڈ..میں قائل ہو گیا ہوں کہ طالبان اور ہم اصل میں دونوں ایک ہیں تو کل سویرے ہی ان میں شامل ہونے کے لیے وزیرستان کو کوچ

کرتے ہیں البتہ اس میں ایک قباحت ہے کہ سفر اتنا طویل نہیں کہ وہاں پہنچیں تو ہماری
داڑھیاں شرعی معیار کی بہار سے آشنا ہو چکی ہوں (۴۳)

اے غزالِ شب کے پاکستانی کردار وہی کردار ہیں جو بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ جو کہ ایک انسان کا بنیادی حق ہوتا ہے اور میسر نہ آئے تو افراد ملکوں ملکوں در بدر ہو کر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اپنی محنت (جنس) فروخت کر کے بطور مشین کام کرتے ہیں۔ آسودگی حاصل کرنے کے لیے دن رات ایک کرتے ہیں اور اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ یہی المیہ محض پاکستان کا نہیں بلکہ تیسری دنیا کے ممالک کا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی سماج کو اندرونی اور بیرونی آمریت اور سامراج نے عوام کی جانوں کا سودا کیا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پاکستانی سماج میں اندرونی سامراج کھل کر سامنے آ گیا۔ جس کے سبب پاکستانی عوام اور سماج کو آگے کی طرف بڑھنے نہیں دیا گیا۔ ۶۰، ۷۰ کی دہائیوں میں غیر یقینی صورت حال اور فوجی آمریت نے سماجی تبدیلیوں کو اپنے مطابق دیکھا اور پاکستانی سماج کو اپنی مرضی کی راہ پر چلنے کے لیے گامزن کیا۔ اس کے اثرات آج موجودہ دور کے پاکستانی سماج میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ امریکہ کو جنگ کو جہاد کا نام دے کر غریب عوام کے بچوں کو شہید کرایا گیا۔ نائن الیون اور دیگر امریکی سرگرمیوں کے باوجود کمیونزم کے خلاف برطانیہ سامراج کے پراپیگنڈے میں سرگرم رہنے والا اندرونی سامراج معاشرے میں زوال اور موجودہ دور کے حالات کا ذمہ دار بنا۔ ۷۰ کی دہائی میں پاکستانی سماج کو عدم تحفظ، عدم برداشت، بے روزگاری اور مذہبی شدت پسندی کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کا ہر طبقہ خواہ وہ طلباء کا ہو یا مزدوروں کا، استحصال کا شکار رہا۔ پاکستان کی سرزمین پر بیرونی اور اندرونی سامراج حکمرانی کرتا رہا۔

سامراج اور نوآبادیات کے خلاف شعور دینے والوں کو جیل میں ڈالا گیا، غداری کا الزام لگایا گیا۔ پاکستان کے منتخب وزیراعظم کو پھانسی پر لٹکایا گیا کیونکہ ان کی موجودگی میں عالمی سرمایہ دار طاقتوں اور ان کے عالمی بینکوں کے بھائیوں کی سرمایہ داری کی موت واقع ہو سکتی تھی۔ اس طرح ادیبوں اور دانشوروں کو سزائے موت اور ٹارچر کا نشانہ بنایا گیا۔ تاکہ آنے والے کو اس سے عبرت حاصل ہو۔ لیکن آگہی اور طبقاتی شعور کے حوالے سے مارکسی تصورات و نظریات اس سخت گھٹن زدہ ماحول میں بھی مستحکم رہے۔ ایسے میں پاکستانی سماج جو جاگیرداری اور سرمایہ داری کا مجموعہ ہے پروان چڑھتا رہا۔ ایسے ہی حالات و واقعات کا ذکر اردو ادب میں ارشد وحید نے گمان اور مستنصر حسین تارڑ نے اے غزالِ شب میں کیا ہے۔

اے غزالِ شب پاکستانی کرداروں کا مجموعی تاثر بیان کرتا ہوا اپنا عہد بیان کر رہا ہے کہ کس طرح تیسری دنیا کے پس ماندہ لوگ انقلاب روس سے متاثر ہوئے اور مزدوروں کی سلطنت ستر ۷۰ سال تک قائم رہی۔ بعد میں ریاستوں کی علیحدگی سے دنیا ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور اس انہدام کے بعد اس نئے سرمایہ دارانہ نظام نے کیا دیا، ان حالات کا بیان اے غزالِ شب میں بھرپور انداز سے کیا ہے۔ اس لحاظ سے مستنصر حسین تارڑ کا ناول اے غزالِ شب بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں سوویت یونین کے عروج و زوال کی داستان کو انتہائی موثر اُسلوب میں پیش کیا ہے۔ سوویت یونین کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کی آمد اور اس کی نوعیت اور اس کی رنگینی کی بھی حقیقی تصویر کشی کی ہے جس سے قاری کو اس دور کے صحیح حقائق کا علم بھی ہو جاتا ہے اور ایک تاریخ کے طالب علم کے لیے بھی اس کی دلچسپی کا سامان بھی پیدا کر دیا ہے اور اس سب پر کردار نگاری مستزاد ہے۔ ان تمام واقعات اور حقائق کو ناول نگاری کے تمام فنی لوازامات کے ساتھ پیش کرنا مستنصر حسین تارڑ کے عمدہ ناول نگار ہونے کا ثبوت ہے۔

حوالہ جات

۱) قراۃ العین طاہرہ، ڈاکٹر، ''اے غزال شب میں سیاسی شعور''، مشمولہ: تخلیقی ادب شمارہ نمبر ۱۰، مدیران، ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر عابد سیال، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲) ایضاً

۳) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۱۳ء ص ۴۷، ۴۸

۴) ایضاً، ص ۵۴

۵) ایضاً، ص ۱۳۱

۶) ایضاً، ص ۱۴۳

۷) ایضاً، ص ۱۳۱

۸) ایضاً، ص ۱۶۷

۹) ایضاً، ص ۱۶۸

۱۰) ایضاً، ص ۸۲

۱۱) ایضاً، ص ۱۳۱

۱۲) ایضاً، ص ۴۶

۱۳) ایضاً، ص ۱۶۶

۱۴) ایضاً، ص ۲۴۸

۱۵) ایضاً، ص ۲۵۰

۱۶) ایضاً، ص ۲۶۳

۱۷) ایضاً، ص ۲۰۴

۱۸) ایضاً،ص۲۸

۱۹) ایضاً،ص۱۴۹

۲۰) ایضاً،ص۱۳۷

۲۱) ایضاً،ص۱۵۳

۲۲) ایضاً،ص۱۶۸

۲۳) ایضاً،ص۱۶۷

۲۴) ایضاً،ص۱۴

۲۵) ایضاً،ص۱۴،۱۵

۲۶) ایضاً،ص۱۵

۲۷) ایضاً،ص۶۵

۲۸) ایضاً،ص،۲۶

۲۹) ایضاً،ص۶۸

۳۰) ایضاً،ص۶۷

۳۱) ایضاً،ص۵۳

۳۲) ایضاً،ص۲۸

۳۳) ایضاً،ص۴۳

۳۴) سفیر اعوان، ڈاکٹر، ''اے غزال شب :اشتراکیت کا نوحہ'' مشمولہ: بنیاد، مدیر، نجیبہ عارف، گرمانی مرکز زبان وادب، لاہور یونیورسٹی مینیجمنٹ سائنسز، شمارہ نمبر۴ لاہور، ۲۰۱۴ء

۳۵) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب،ص۵۴

۳۶) ایضاً،ص۶۵

۳۷) ایضاً،ص۱۱۷

۳۸) ایضاً،ص۱۰۵

۳۹) خالدفتح،اے غزال شب ؛ایک مطالعہ،(غیرمطبوعہ)

۴۰) مستنصرحسین تارڑ، اے غزالِ شب،ص۱۰۷

۴۱) ایضاً

۴۲) ایضاً،ص۱۶۰،۱۶۱

۴۳) ایضاً،ص۲۳۸،۲۳۹

باب پنجم

گمان اور اے غزالِ شب میں سقوطِ سوویت یونین کا تقابلی جائزہ

الف: گمان اور اے غزالِ شب میں مارکسی تصورات

ناول کا عنوان ''گمان'' غیر یقینی صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔ گمان مارکسی تصورات، پاکستانی سماج میں اس تحریک کا آغاز، نشو ونما اور شکست، نظریاتی کشمکش، ایک مساوی اور مثالی معاشرے کا قیام، سرخ سویرا کا خواب اور بیسویں صدی میں پاکستانی سماج میں بائیں بازو کی تحریک کی حقیقت پسندی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ مصنف ارشد وحید نے اس ناول میں ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۸۹ء تک کے پاکستانی سماج کی تصویر کشی کی ہے۔

دوسرا ناول اے غزالِ شب مستنصر حسین تارڑ کا لکھا گیا ہے۔ اس ناول کا عنوان جدید نظم کے معروف شاعر ن م راشد کے شعری مجموعے لا =انسان میں مشمولہ نظم اے غزالِ شب سے اخذ کیا گیا ہے۔

نظم اور ناول کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ ناول کی پوری فضا پر مسلسل ایک اداسی کی کیفیت طاری ہے۔ کیونکہ اس کا کرب اور المیہ صرف ایک انسان یا کردار کا المیہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظام اور فکر کا ہے جس سے وابستہ افراد مختلف ملکوں سے نظریاتی طور پر وابستہ ہیں۔

اے غزالِ شب میں جہاں اشتراکی تصورات کا ذکر ہوا ہے وہاں ساتھ ہی سرمایہ دارانہ نظام پر بھی بات کی گئی ہے۔ اس ناول میں مصنف نے اشتراکی خواب سے جڑے ہوئے افراد کا المیہ درد بیان کرتے ہوئے ایک نئے نظام (سرمایہ دارانہ نظام) کی خامیاں اور مسائل کا بیان بخوبی کیا ہے۔ سوویت یونین کا انہدام اس ناول کے علاوہ کسی دوسرے اردو ناول میں اس طرح تخلیقی موضوع کے طور پر بیان نہیں ہوا ہے۔ تارڑ کا یہ ناول ۲۰۱۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔

گمان اور اے غزالِ شب دونوں ناولوں کا موضوع مارکسی تصورات پر مشتمل ہے اس لیے ان دونوں ناولوں کا تقابلی مطالعہ اہمیت کا حامل ہوگا۔ دونوں ناولوں میں مارکسی تصورات کی عکاسی، پاکستانی سماج میں بائیں بازو کی تحریک کے اتار چڑھاؤ، سقوطِ سوویت یونین، سقوط کے بعد کے حالات کا بیان ملتا ہے اس وجہ سے دونوں کو تقابلی مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول گمان کا انداز روایتی اور آغاز تجسس جبکہ اے غزالِ شب کے آغاز میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ ناول کے آغاز میں ظہیر الدین کا کردار ماضی کی یادوں کے زیر اثر ماسکو میں رہتے ہوئے خود کو بورے والا پاکستان میں پاتا ہے۔

ناول گمان میں مصنف پاکستانی سماج میں مارکسی تصورات سے بھری زندگیوں کی منظر کشی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> الماریوں کے دروازوں سے لٹکائے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ٹوٹی ہوئی زنجیر اور کسرتی بدن والے، آسمان کی طرف تکتے ہوئے، ہاتھوں میں مشعل لیے انسانوں کی تصویروں والے زرد اور سرخ پس منظر پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں اوور کوٹ پہنے اور بڑی سی داڑھیوں والے دو آدمیوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ کارنس پر ایک ایک چھوٹا سا مجسمہ رکھا تھا۔ سیاہ رنگ کا یہ مجسمہ ایک دراز قد آدمی تھا، جس نے انہیں کی طرح کا ایک لمبا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی انگلی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کئی بہت بڑے مجمع سے خطاب کر رہا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں پڑے ٹرنک میں ایک اخباری کاغذ والے پوسٹر کا ایک کونہ اٹکا ہوا تھا۔ سرخ پس منظر میں یہ سیاہ رنگ سے بنا ہوا ایک نوجوان شخص کا خاکہ تھا جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ سر پر ایک سپاہیوں والی ٹوپی رکھی تھی جس کے سامنے کے رخ پر ایک ستارہ بنا ہوا تھا اور اس کے نیچے انگریزی میں لکھا تھا ''چے گویرا''۔(۱)

اس طرح کے مارکسی تصورات کا اظہار مستنصر حسین تارڑ کے ناول اے غزالِ شب میں بھی ہوا ہے۔ اے غزالِ شب میں ان تصورات کا اظہار یوں ملتا ہے:

> گالینا تو چپ رہتی تھی۔ اپنی وہیل چیئر میں چپ رہتی تھی لیکن اس کی بیٹی سویٹ لانا ایک طنزیہ مسکراہٹ اپنے باریک ترشے ہوئے ہونٹوں پر سجائے کہتی تھی کہ ڈیڈی... ان دنوں کھو سے گئے ہیں... آپ ہمہ وقت کسی خواب میں رہتے ہیں اور کسی آک کے بوٹے میں جنم لینے والی سفید ہلکی پھلکی روئی سے بھی ہلکی پریوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں جو مائی بوڑھیاں کہلاتی ہیں... پلز یوں حواس گم نہ کیجیے... کچھ ضبط کیجیے... یہ محض ایک ذہنی انتشار ہے... آپ کا وہم ہے...(۲)

ناول گمان میں مارکسی کرداروں کو جن مسائل کا سامنا تھا اس کا بیان بخوبی طور پر جا بجا ملتا ہے کہ مارکسی

کردار کس طرح پاکستان میں رائج جاگیردارانہ نظام کو بدل کر اس کی جگہ ایک نیا غیر طبقاتی نظام ''کمیونزم'' لانا چاہتے ہیں۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مارشل لاء اور سماجی گھٹن میں مارکسی تصورات اور تحریک کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ کیسے مارکسی نظریات کا پرچار کرنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ ناول گمان میں ایسے کردار موجود ہیں جو آپس میں مارکسی نظریات اور خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، اس کے لیے یہ سب مرتضیٰ کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔ ناول میں ان حالات کا بیان کچھ یوں ملتا ہے:

> ''ارے یار'' مارکس اور اینگلز کی تصویروں سے مٹی تو جھاڑ لیا کرو'' ''فہیدہ بولی اور پھر اس نے آسمان کی طرف اٹھائے شخص کے سیاہ رنگ کے مجسمے کو صاف کرتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا'' اور کامریڈ لینن کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کر رہے۔ (۳)

انقلاب روس سے تیسری دنیا کے استحصال شدہ لوگ بہت متاثر ہوئے تھے۔ ایک غیر طبقاتی معاشرہ، عوام، مزدور اور کسان کی حکومت تو ایسے میں سرخ سویرا خواب بلکہ اشتراکی نظام کے مارکسی اصولوں پر قائم سماج ان کے لیے کسی جنت سے کم نہ تھا۔ اس طرح کے مارکسی تصورات کی عکاسی اے غزالِ شب میں ان الفاظ میں ملتی ہے:

> ماسکو کے آسمان نے بھی اس کی ان آنکھوں کے سامنے کیسے کیسے رنگ بدلے تھے ...تب یہ آنکھیں چمکیلی اور امید کے چراغوں سے روشن ہوا کرتی تھیں جن کے اندر سوائے سرخ سویرے کے خواب کے اور کوئی خواب نہ تھا...ان زمانوں میں اس کا پورا منہ زور نوخیز بدن سرخی کی سرمستی سے دہکتا اسے ایک وائی خمار میں لے جاتا جہاں سوائے تیسری دنیا کے دھتکارے، کچلے ہوئے، ستم رسیدہ اور غربت کے مارے لوگوں کے اور کوئی نہ ہوتا...ایسے لوگ جن کے پاس اپنے پاؤں میں پڑی بیڑیوں کے کھلونے کے سوا اور کچھ نہ تھا...اور یہ وہ تھا ظہیر الدین جس نے ان کے ہاتھ تھام کر انہیں ذلت کے گڑھوں میں سے نکال کر ایک سرخ جنت کی جانب لے جانا تھا..(۴)

ناول گمان میں حقائق کو عقیدت سے نہیں بلکہ زمینی حقائق کو معروضی صورت میں بیان کیا ہے کہ پاکستانی سماج میں مارکسی تصورات کے سامنے کس قسم کے کردار اور اور مسائل حائل تھے۔ یہاں پاکستانی معاشرے میں مذہب کا سہارا لے کر لوگوں کو حقائق جاننے سے دور رکھا گیا۔ امریکی ڈالر کے حصوں کو جہاد کا نام دے کر عقیدت

مند غریب لوگوں کو استعمال کیا گیا۔ پاکستانی سماج کو مولوی ازم نے جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ افغان جنگ کے نتائج کی صورت میں سامنے آیا۔ مولوی اور ملا نے سوویت یونین کے زمانے میں جنرل ضیاالحق کی آمریت کا ساتھ دیا اور امریکہ کے کہنے پر جہاد کا آغاز کیا۔ مولویت، آمریت، طبقاتی تقسیم، جاگیردارانہ طرز حکومت اور مختلف مسالک نے پاکستانی سماج کو درست نصب العین کا تعین نہیں کرنے دیا لیکن ان حالات کے باوجود بھی مارکسی و اشتراکی پسند نظریات کا سفر کسی نہ کسی صورت جاری رہا جو کہ مارکسی فلسفے کی عظمت کو بیان کرتا ہے۔ گمان میں اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے:

> یہ تاریخی جبریت سب فراڈ ہے۔ یہ سب اسی طرح ہے جیسے مولوی جنت کے خواب دکھا کر موجودہ جبر کو صبر سے سہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ تم لوگ بھی بس لکیر کے فقیر بنے رہو۔ کوئی طریقہ حتمی نہیں۔ ہمیں نئے راستے بنانے چاہئیں۔ تم لوگ بس مکھی پہ مکھی مارے جایا کرو۔ اور خوش رہو کہ کام کر رہے ہو۔ مرتضٰی نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ (۵)

اے غزالِ شب کے تقریباً تمام کردار ایک ہی نظریے کے قائل اور ایک ہی کشتی کے مسافر نظر آتے ہیں۔ مصنف نے جہاں جہاں اشتراکی نظریے کی شکست کا ذکر کیا ہے، وہاں نئے نظام (سرمایہ دارانہ نظام) کا وحشیانہ چہرہ بھی بے نقاب کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ اس ناول میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے، ظہیر الدین کا کردار ناسٹلجیا کا متاثر نظر آتا ہے۔ اشتراکیت کے انہدام کے بعد روس میں اپنے وطن کو یاد کرنا، ماسکو میں مائی بوڑھیاں نظر آنا وغیرہ وغیرہ، سماجی ناہمواریوں کے شکار غیر مساوی سماجی نظام، اور ذلتوں اور محرومیوں کے شکار لوگ، مختلف مذہب، نسل سے تعلق رکھنے والے سب نے ایک مثالی اور خوشحال معاشرے کا خواب دیکھا تو سب لوگ سوویت یونین کا حصہ بنے، ایک ایسی سلطنت جس میں مزدوروں کی حکومت ہوگی، انصاف ہوگا، تو ایسے میں ناول اے غزالِ شب میں ایک کردار ظہیر الدین جو آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر اپنے والد کا چہرہ مبارک اپنے چہرے میں دیکھتا ہے۔ انسان فکری سفر کے بعد اپنے اعمال پر سوچتا ضرور ہے لیکن ظہیر الدین جو کہ ایک نظریاتی بلکہ تربیتی طور پر اشتراکی نظریے سے جڑا تھا، اس کے اور اس کے رفقاء کے خواب کی تعبیر کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ نئے نظام نظام کے خلاف مزاحمت کرتا ہے کیونکہ ظہیر الدین کے والد ایک مارکسی ٹریڈ یونین کے لیڈر رہے اور غیر طبقاتی نظام سے لڑائی اور اس کے خلاف مزاحمت کی قوت سان کے اندر بھی ہے۔ اے غزالِ شب میں ان حالات و واقعات کو

یوں بیان کیا گیا ہے:

> کیا کبھی کسی نے اپنے کسی ایک خواب کی اتنی بھاری قیمت ادا کی کی ہے جتنی وہ کر رہا تھا ...اس جیسے اور بھی بہت تھے...مختلف قومیتوں اور نسلوں کے...افریقی، ایشیائی اور جنوب امریکی کو اپنی آبائی شناخت اور عقیدے ترک کر کے ایک سرخ سویرے کی نمود کی چاہت میں یہیں اس ''مزدور سلطنت'' میں رچ بس گئے تھے کہ وہ اس جنت کے وعدوں پر کیسے یقین کرتے کہ ان کے آس پاس انسانیت کے پاؤں میں جبر اور غربت کی زنجیریں تھیں، بے شک وہ قادر و عادل ہے لیکن اس کے جہاں میں بندۂ مزدور کے اوقات بہت سخت ہیں تو پھر وہ کیسا قادر و عادل ہے...اور اس پر انحصار کیا کرنا...ظہیر الدین کے بائیں رخسار پر ایک ہلکی سی ابھی تک خون آلود خراش موجود تھی اور یہ تب اس کے ماس پر کھینچی تھی جب اس نے آئینے میں اپنے آپ کی بجائے اپنے باپ کو دیکھا تھا اور اس کا ہاتھ لرزش میں آ گیا تھا...اور یہ آج صبح کا قصہ تھا جب وہ اپنے مختصر غسل خانے میں شیو بنا رہا تھا اور سویٹ لان اور بورس باری باری دروازے کو پیٹ رہے تھے کی یہ فلیٹ کا اکلوتا غسل خانہ تھا اور انہیں بھی تیار ہو کر اپنے کام کاج پر جانا تھا۔۔۔(۶)

قیامِ پاکستان کے بعد لوگ عہدے، دولت اور زمینیں حاصل کرنے کے چکر میں تھے۔ جبکہ ان سخت گمبھیر حالات میں مارکسی کردار، مارکسی فلسفے اور اظہار رائے کی آزادی کا پرچار کرنے میں مگن تھے حالانکہ عملی طور پر انہیں قید و جبر اور جلاوطنی کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن یہ باشعور افراد مارکسی فلسفے سے پسماندہ افراد کے لیے عملی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے جب کہ ان کے عہد کا پاکستانی سماج سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کا مجموعہ تھا۔ سماج کی یہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ سوچ، میانہ روی و مساوات کے ان عظیم خیالات و نظریات کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف رہی۔ ناول گمان میں ایسے حالات بیان کیے گئے ہیں کہ کیسے مفاد پرست طبقہ اشرافیہ مارکسی کارکنان کے خلاف کیس بنا کر جیل بھیجتا ہے اور مزید سازشیں بھی رچنے لگتا ہے۔ کارکنان کی محنت، کوششوں اور کاوشوں کا گمان میں یوں ذکر ملتا ہے:

> اس کے بعد وہ کبھی کبھار ہی ان کے گھر آیا تھا۔ اس کے بارے میں فہمیدہ نے بتایا تھا کہ اکثر

وہ شہر سے باہر ہی رہتا ہے۔مختلف گاؤں میں سٹڈی سرکل لیتا ہے۔اور ایک تنظیم منظم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ان کے گھر بھی وہ بہت جلدی میں آتا اور تھوڑی دیر بعد کچھ کتابیں اور پمفلٹ چھوڑ کر چلا جاتا۔کبھی وہ فہمیدہ کے ساتھ اس کے گھر جاتی تو بھی وہ اسی کے ساتھ گفتگو میں مصروف رہتا۔عموماً وہ کہیں سے آ رہا ہوتا یا کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہوتا تھا۔(۷)

گمان اور اے غزالِ شب میں موضوع اور مشاہدہ اس قدر حقائق پر مبنی ہے کہ قاری کو روس اور پاکستانی سماج کا حقیقی عکس سامنے دکھتا ہے۔ اے غزالِ شب میں پاکستانی معاشرے کے ابتدائی دور میں رونما ہونے والی مارکسی صورت حال کا بیان ، ریلوے فیکٹری، واپڈا ورکر، اور انڈسٹری ٹیکسٹائل ملز میں مزدوروں کے حالات و واقعات کے ذریعے پیش کیا گیا ہے کہ یہاں کس طرح مزدور ورکر پارٹی کے لوگ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کی آواز عملی طور پر بلند کرتے تھے۔حالانکہ یہاں پاکستانی سماج میں سخت آمریت کے دور مین ان ورکرز اور ٹریڈ یونین کے لوگوں کا روسی سفارت خانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا لیکن مارکس، اینگلز اور لینن کی تعلیمات کو عملی سمجھتے ہوئے مزدور کے پسینے اور حق کی آواز بلند کرتے۔ناول اے غزالِ شب میں تارڑ ان مارکسی تصورات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

شمس الدین انقلابی کا ہر غضب چہرہ...وہ احتجاجی جلوسوں کی قیادت کرتا جب سٹیج پر کھڑا ہوتا تو پس ماندگی اور لاچاری کی چکی میں پسے ہوئے لوگ اسے ایسے عیسیٰ کے روپ میں دیکھتے جو اپنی بھیڑوں سے مخاطب ہو...لیکن وہ انہیں خدا کی سلطنت کی نوید نہ دیتا، مزدوروں کی سلطنت کی خوشخبری سناتا...حکومتِ وقت کی کال کوٹھڑیاں بھی اس پر رشک کرتیں کہ یہ کیسا شخص ہے جو بکاؤ مال نہیں...کہ ان میں سے کچھ تھے جو یہ سختیاں جھیل نہ سکے اور مناسب معاوضے کے عوض تائب ہو گئے لیکن شمس الدین انقلابی کی رگوں میں جو خون تھا اس کی گردش کا سبب مارکس ، اینگلز اور لینن کے نظریات اور ان کے فرمودات تھے...ان پیغمبروں کی کتابیں جو اس کے دو کمروں کے بوسیدہ کواٹر میں سجی تھیں، وہ آسمانی صحیفے تھے جن پر وہ ایمان لے آیا تھا..اسے توقع تھی کہ کم از کم وہ قادر و عادل ہوں گے..(۸)

گمان اور اے غزالِ شب دونوں ناولوں میں پاکستانی سماج میں مارکسی لٹریچر کے فروغ کے ماحول کو بیان کرتے ہوئے مصنفین نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے اس مکتبہ فکر نے کس طرح علمی نشستوں کی صورت میں شعور کی پختگی کی خواہش اور حصول کی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان کو معلوم ہو سکے کہ اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ طبقاتی تقسیم، مساوی معاشرہ کیوں معاشی ناانصافیوں پر تقسیم ہو رہا ہے؟ گمان ناول میں مصنف نے خوبصورتی سے مارکسی کرداروں کے ذریعے لٹریچر تبلیغ کتب کا آئینہ پیش کیا ہے۔ یہ کردار اکثر میکسم گورکی اور روسی لیٹریچر کے ساتھ مزاحمتی ادب اور کتب کو پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے عوام میں شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے۔ گمان میں اس کا ذکر اس حوالے میں دیکھا جا سکتا ہے:

> فہمیدہ کمرے میں داخل ہوئی تو عفت کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، اور اس قدر مگن تھی کہ اسے فہمیدہ کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اس کے اردگرد اور بھی بہت سی کتابیں پڑی ہوئی تھیں ۔فہمیدہ اس ک ءقریب بیٹھ گئی اور قریب پڑی کتابوں پر نظر ڈالی۔ 'انسان بڑا کیسے بنا' خاندان' ملکیت اور ریاست کا آغاز وغیرہ۔ ایک کونے میں ناول 'ماں' کا مجلد ایڈیشن پڑا تھا' عفت کے ہاتھ میں ایک پنسل تھی جس سے وہ کبھی کبھی کتاب کے صفحے پر کوئی نشان یا لکیر لگاتی تھی۔ فہمیدہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے انگلیوں سے میز بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ 'آج کل بس انہی کتابوں پر گزارا ہے!' (۹)

کسی بھی ملک میں کسی دوسرے ملک کا سفارتخانہ جو کردار ادا کرتا ہے اس کا اظہار ہمیں امریکہ اور روس کے سفارتخانوں کی خدمات سے ہوتا ہے۔ یہ سفارت خانے اپنے ملک کی ترقی اور نظریات وعقائد کا مکمل نمائندہ ثابت ہوتا ہے۔ سفارتخانے دوسرے ممالک کے اذہان اور اداروں پر اپنے ملک کی سوچ اور نظریات کی ترجمانی کرتا ہوا اپنے ملک کے سبز باغات دکھاتا ہے، ان اداروں اور اذہان کو اپنا حامی بناتا ہے اور اپنے نظریات کے دفاع کی ہر ممکن کوشش کرتا اور ہر مدد کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

ناول اے غزالِ شب میں سوویت یونین کے سفارت خانے کا ذکر مستنصر حسین تارڑ تاریخ کی روشنی میں کرتے ہیں۔ اور وجہ پیش کرتے ہیں کہ کس طرح ظہیر الدین اور دیگر کرداروں کو سوویت یونین جانے کا موقع ملا۔ شمس الدین کو بغیر کسی تعلق کے روس جانے کا موقع ملا۔ لیکن سوویت یونین کا سفارت خانہ تیسری دنیا کے مظلوم

عوام کی خدمت میں سرگرم رہا تو مختلف طرح کی اسکالرشپ اور وظیفوں کی صورت میں شمس الدین اور اس کے بیٹے کو سویت سونین بھیجا گیا۔ حالانکہ شمس الدین کسی بھی مفاد کے بغیر ان نظریات وعقائد پر یقین رکھتا اور عدل وانصاف، مزدور کی عزت اور قدر کا مطلوب ہے۔ انہی خیالات کی بناء پر ان کے بیٹے ظہیر الدین کو ماسکو یونیورسٹی کی اسکالرشپ کی دعوت ملتی ہے لیکن عملی طور پر سماج سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تو ایسے میں وہ روسی سفارت خانے کی پیش کش کو قبول کرتا ہے۔

> پاکستان میں سوویت یونین کا سفارت خانہ شمس الدین انقلابی جیسے نظریاتی مزدور لیڈروں پر اپنی عنایات کی بارش کرنے کی کوشش میں مشغول رہتا لیکن شمس الدین ان عنایات کی بارشوں میں بھیگنے سے گریز کرتا کہ وہ کسی صلے یا ستائش کا تمنائی نہ تھا.. وہ دل و جان سے مساوات اور عدل پر مبنی ایک ایسے نظام کے لیے جدوجہد کر رہا تھا جس کا وعدہ اس کے اسلام نے تو کیا تھا لیکن وہ ایفا نہ ہوا تھا.. لیکن جب سفارت خانے کے فرسٹ سیکٹری نے نفس بہ نفس اسے پیشکش کی کہ ہم آپ کے برخوردار کو ماسکو کی سٹیٹ یونیورسٹی میں جو بعد مین کانگو کے عظیم لیڈر پیٹرس لومبا کے قتل کے بعد پیٹرس لومبا یونیورسٹی کہلائی، ایک خصوصی سکالر شپ کے تحت پڑھائیں گے اور وہاں سے اپنی پسند کے موضوع پر ڈگری حاصل کر سکتا ہے تو شمس الدین کے اجتناب پر اولاد کی محبت حاوی ہوگئی اور وہ انکار نہ کر سکا.. اس نوعیت کی سہولت سوویت یونین سفارت خانہ نہ صرف پاکستان بھر کے بلکہ دنیا بھر کے انقلابی اور ٹریڈ یونین کے لیڈروں اور ہم خیال کمیونسٹوں کے بچوں کو بخوشی فراہم کرتا تھا..(۱۰)

ناول گمان میں بائیں بازو کی تحریک کو تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح انقلابِ روس کے اثرات برصغیر بالخصوص پاکستانی سماج پر پڑے اور بائیں بازو کی تحریک نے کس طرح پاکستانی معاشرے میں اپنے آپ کو قائم کیا۔ کن مسائل کے باعث ان کا آغاز ہوا اور آگے انہیں کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

بائیں بازو کی تحریک سے وابستہ کارکنوں پر ظلم و جبر اور سازشیں، جیل اور فوجی آمریت نے انتقامی کاروائی کا نشانہ بنایا۔ مفاد پرست سیاست دانوں نے بائیں بازو کی تحریک سے وقتی طور پر فائدہ اٹھا کر انہیں استعمال کیا۔ سیاسی لیڈروں نے اس تحریک کے افراد کو لالچ اور نوکریوں کی صورت میں اپنی پارٹی کو چمکانے کے لیے استعمال کیا۔ بائیں

بازو کی تحریک سے وابستہ نظریاتی افراد کا کہنا تھا کہ ہمارے ملک کا نظام جو جاگیرداری اور سرمایہ داری کا مجموعہ ہے اس کے بجائے عوام کو متبادل نظام اور کلچر دینا چاہیے۔ اس تحریک کے نظریاتی افراد اپنے سٹڈی سرکل میں ان موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں، ناول میں اس کا بیان کچھ یوں ملتا ہے:

> مگر پھر بھی ان جیسے طور طریقے تو اپنانے ہی چاہیں۔ خدا بخش نے زور دیتے ہوئے کہا۔ 'پہلے ہی ہم پر بوجھ کیا کم ہے جو اپنے آپ کو مزید قید کر لیں۔ خواہ مخواہ کی منافقت، ویسے بھی ہمیں لوگوں کو ایک متبادل کلچر دینا چاہیے۔ لوگوں کی طرح ہی زندگی گزارنی ہے تو سارے عمل کا کیا فائدہ؟۔ ان کی بحث تلخ تر ہوتی چلی گئی، خدا بخش نے اچانک جھنجھلا کر کہا' تم سمجھتے ہو کہ چرس کے کش لگا کر انقلاب لے آؤ گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے' (۱۱)

اے غزالِ شب میں بھی مارکسی تصورات، پاکستانی سماج اور سوویت یونین کی عکاسی یا منظر کشی بہت عمدگی سے کی گئی ہے۔ اے غـــزالِ شـــب پاکستانی سماج میں اشتراکی نظریات اور اس فکر سے متاثر افراد کا بیان کرتے ہوئے عالمی منظر نامہ زیر بحث لایا گیا ہے۔ اے غـــزالِ شـــب ناول اشتراکیت کے انہدام کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کے کھوکھلے پن کا اظہار بھی ہے جس کا نقصان علم و ادب کو پہنچا۔ گالینا ، ظہیر الدین کی بیوی ایک روسی خاتون ہے اے غـــزالِ شـــب میں ایک مزدور کی بیٹی ہے جو مارکسزم کے مساوی نظریے پر دل و جان سے زیادہ یقین رکھتی ہے۔ ظہیر الدین اور گالینا شادی کے بعد مارکسزم کے لیے یک جان ہو کر خدمات سرانجام دیتے ہیں، ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اشتراکیت اور مساوی سماج کے ترانے گاتے ہیں تو لوگ ان پر رشک کرتے ہیں کہ یہ وہ عظیم لوگ ہیں جو وطن، مذہب، رنگ اور نسل کو چھوڑ کر مارکسی نظریات کو بنیاد بنا کر ایک عظیم طبقاتی سماج میں اہم ذمہ دارہ انجام دے رہے ہیں۔ یہ مناظر گالینا کی جوانی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> وہ گالینا.. جو ماسکو کے نواح میں واقع ایک اجتماعی فارم میں جھونپڑا ڈالے ایک کھیت مزدور کی بیٹی تھی اور تہہ دل سے ایک ایسے نظام کے ظہور پذیر ہونے پر یقین رکھتی تھی جو دنیا بھر کے مزدور کو رکسانوں کو ایک سرخ سویرے میں رنگ کر ان کی قسمت بدل دے گا.. وہ پاکستان سے آئے ہوئے اور کلاس میں اکثر چپ رہنے والے بدھو سے خوش آثار نوجوان پر فدا ہو گئی.. روسی لڑکیاں عام طور پر بہت پریکٹیکل ہوتی ہیں، ہو کسی الوہی خوابناک محبت کے انتظار

میں زندگی نہیں گنواتیں، اگر کوئی دل کو بھا گیا ہے اور اس کے کمیونسٹ نظریات بھی مستحکم ہیں
تو اسے کیوں کھویا جائے..تب اپنے پھولدار فراک میں کیسی بھری بھری، متناسب اور بدن کو
فوری طور پر قربت کے ہیجان سے آشنا کرنے پر قادر ہوا کرتی تھی..(۱۲)

مارکسی تصورات اور پاکستانی سماج گمان میں اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ جس سے کمیونسٹ سماج کا نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے۔ دیکھا جائے تو قوموں کی عروج و زوال میں طبقات کا کردار بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ طبقاتی تقسیم، طبقاتی کشمکش انسانی نیچر کا نہیں بلکہ ذرائع پیداوار پر منحصر ہے۔ طبقاتی کشمکش کی صورت میں دو طبقات سامنے آتے ہیں، ایک بورژوا اور دوسرا پرولتاری۔ ذرائع پیداوار ذاتی ملکیت کی وجہ سے مزدور، کسان روزی روٹی کمانے کے لیے محنت (جنس) کو فروخت کرتے ہیں ان کو پرولتاری کہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرا طبقہ جو مزدوروں، کسانوں اور غلاموں کی محنت (جنس) کو خریدتا ہے ان کو بورژوا کہا جاتا ہے۔ تاریخ انسانی میں ان دونوں کی ضروریات اور خواہشات ہمیشہ الگ تھلگ رہی ہیں۔ سرمایہ دار ہمیشہ سے مزدور کا استحصال کرتا رہا ہے جبکہ مزدور اپنی محنت بیچ کر فروخت کر کے زندہ رہا ہے لیکن یہ سلسلہ سرمایہ دار سے شروع نہیں ہوتا بلکہ اس سے پہلے یہ سلسلہ جاگیردارانہ نظام میں یہ تضاد چلتا رہا، تب آقا اور غلام کے مابین یہ کشمکش جاری رہی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ طبقاتی ''حیثیتی'' تضاد ہی دنیا میں بغاوتوں اور انقلاب کی وجہ ہے۔ کمیونسٹ سماج جو ایک غیر طبقاتی نظام پر مشتمل ہوتا ہے اس میں یہ ممکن ہے کہ ریاستی جبر کی ضرورت ہی نہ ہو۔ وہاں تمام ضروریات عوام کی رسائی میں ہوں گے جو ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ ناول گمان میں اشتراکی و مارکسی تصورات و نظریات کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

''انسانی نیچر بھی'' کوئی شخص یوں گفتگو کر رہا ہوتا'' کمیونسٹ نظام کے حق میں گواہی ہے۔
انسانی جسم بتدریج اپنے اعضاء کے استعمال میں خودکار ہوتا جا رہا ہے۔ ذہن کا کنٹرول سسٹم
اب عضو کے آزادانہ اختیار کے حق میں راہ دے رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا دماغ کا کام
محض سوچنا رہ جائے گا۔ ہاتھ اپنے طور پر ہلیں گے۔ معدہ اپنے طور پر کام کرے گا اور دل تو
تم جانتے ہی ہو کہ خودکاری کی مکمل مثال ہے۔ کمیونسٹ سماج کی طرح جہاں ریاستی ڈھانچے
کی ضرورت ختم ہو جائے گی اور ہر انسان فطری طور پر ہر کام احسن انداز سے خود ہی انجام
دے گا۔(۱۳)

لے غزالِ شب میں مارکسی تصورات کا تکرار اور پاکستان میں روسی معاشرے کی منظر نگاری اس طرح سے ہوئی ہے کہ قاری کے سامنے وہی منظر ابھر آتا ہے۔

لے غزالِ شب کا عنوان اور موضوع دو تہذیبوں اور ان میں موجودہ لوگوں کے کرب اور جذبات کو آسان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ لے غزالِ شب میں روسی کرداروں کا پاکستان میں آنا اور یہاں ان کے ساتھ نظریاتی وابستگی کو جس طرح تارڑ نے بیان کیا ہے وہ اس کے تخلیقی اظہار کی نشاندہی کرتا ہے۔

> اور شمس الدین کے لیے..گالینا، اس کی بہو، کوئی عام لڑکی نہ تھی..وہ ایک سرخ سویرا تھی جو اس کے عسرت زدہ کواٹر میں طلوع ہو گیا تھا..وہ ہمیشہ اسے نہایت عقیدت اور احترام سے تکتا.. کہ میں کیسا بخت آور ہوں کہ میرے اس گھروندے میں لینن کے دیس کی، سوویت یونین کی سرزمین پر جنم لینے والی لڑکی..میری بہو کے روپ میں اتری ہے..میرا بس چلے تو میں اس کے پاؤں دھو دھو کر پیوں۔۔(۱۴)

ناول گمان میں مارکسی نظریات کے پرچار کے دوران پیش آنے والے مسائل کا آئینہ پیش کیا گیا ہے کہ آمریت کے دور میں مارکسی لٹریچر اور خصوصی طور پر مزاحمتی ادب پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں پر سماجی پابندیاں عائد تھیں تو ایسے میں مارکسی کردار کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں۔ اس کا ذکر بار بار ناول میں نمایاں طور پر ملتا ہے جب کبیر، مراد سے کہتا ہے:

> 'یاران کا کوئی لٹریچر بھی چھپتا ہے'
>
> ایک دن اس نے مراد سے پوچھا۔
>
> 'ہاں' مراد نے جواب دیا۔
>
> 'مل سکتا ہے؟'
>
> کوشش کرتے ہیں شاید مل جائے۔ ایک دو لوگ میرے واقف ہیں۔ ان سے بات کرتا ہوں' مراد نے مبہم سا جواب دیا۔۔تم پڑھ کر اسے جلا دینا' اس نے کہا۔(۱۵)

لے غزالِ شب میں مارکس کردار جس طرح پاکستانی سماج میں دکھائے گئے ہیں ان میں حقیقت کا عکس نظر آتا ہے۔ لے غزالِ شب پاکستانی اور روسی کرداروں کا مجموعہ ہے۔ اس ناول کے کرداروں سے پتا چلتا ہے

کہ پاکستانی کردار کس طرح نظریاتی وابستگی اشتراکیت سے رکھتے تھے، سماجی ناہمواریوں کا حل اشتراکی نظام ایک غیر طبقاتی معاشرہ چاہتے تھے۔ان کرداروں کی عملی سرگرمیاں ہمیں شمس الدین اور ظہیر الدین کرداروں سے جا بجا طور پر ملتی ہے۔شمس الدین جو کہ ایک ٹریڈ یونین کا لیڈر ور کر ہے لیکن مارکسی نظریات سے وابستگی بغیر کسی مفاد کے بلکہ مزدوروں کی حقوق اور سامراجی قوتوں کے خلاف ایک عملی آواز، جس کی بنا پر حکومت وقت ان کو قید، تکالیف کی صورت میں یہاں تک کہ ان کو پھانسی دی جاتی ہے۔پاکستانی سماج میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، طبقاتی کشمکش، قومیتوں کا مسئلہ اس طرح بہت سارے مسائل جو سماجی ناہمواری کی صورت میں کسی سماج میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ان کا حل مارکسی نظریات اور ان کا اطلاق لازمی سمجھتے ہوئے غیر طبقاتی سماج کی تشریح و تعبیر کرنا ایک مارکسی مفکر اور مارکسی نظریات میں شامل ہے۔

ناول لے غزالِ شب میں مارکسی نظریات و تصورات کا اظہار ظہیر الدین کے کردار کے ذریعے اس طرح ہوا ہے:

> ابا..آپ اس ملک میں جس نظام کو لاگو کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں میں اس نظام میں پہنچ چکا ہوں..کوئی دن جاتا ہے جب دنیا بھر کے کچلے ہوئے لوگ اپنی زنجیریں توڑ کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور ہم سب بلا تفریق ملت و مذہب..ایک ہی مساواتی کڑی میں پرو دئے جائیں گے..میں اس کمیونسٹ نظام کے پایۂ تخت میں ہوں..اور میں دنیا بھر میں سرخ انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد میں معاون ثابت ہو سکتا ہوں..وہیں ٹھہرنا چاہتا ہوں..آپ کے خواب میں زندگی کرنا چاہتا ہوں..(۱۶)

ناول گمان میں مارکسی تصورات اور نظریات کے پرچار میں جو سماجی رکاوٹیں حائل تھیں، ان کا اظہار بہت عمدگی سے ہوا ہے۔ایک دستاویز کی صورت رکھتے ہوئے یہ ناول قاری کو مجبور کرتا ہے کہ کہ اس عہد کے مسائل اور آمریت میں ہونے والی تبدیلیوں اور سہی جانے والی تکالیف کا بغور جائزہ و مطالعہ کیا جائے۔کہ کس طرح ایک ڈکٹیٹر عوام کی سوچ کو خوف اور دہشت سے بھر کر کس طرح اپنی سامراجی پالیسی مسلط کرتا ہے۔عوام کی غیر یقینی صورت حال، سیاست دانوں پر عدم اعتماد اور فرقہ واریت کو فروغ، اس طرح کے دیگر مسائل گمان میں مارکسی تصورات اور پاکستانی گھٹن زدہ سماج میں مارکسی کرداروں کا ارتقاء، پاکستان اور انڈیا کی جنگیں، ملک میں بار بار

مارشل لاء، مشرقی پاکستان کا علیحدہ ہونا اس غیر یقینی صورت حال میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

تاریخ میں یہ ہونا عام ہے کہ اکثریت اور اقلیت میں واضح فرق رہا ہو، دونوں کی نظریاتی، مادی اور جسمانی جنگ میں کبھی اکثریت تو کبھی اقلیت کو جیت ہوئی ہو۔ یہاں بھی ایک ایسا ہی سیاسی وسماجی اور خصوصی طور پر معاشی نوعیت کا مسئلہ موجود تھا جو دو دو نظاموں کی جنگ کا محرک تھا۔ ایسے حالات وواقعات میں مارکسی نظریات کا پراثر ہونا، عوام میں شعور بیدار کرنے کا بہترین اور مؤثر ذریعہ تھا۔ ان حالات میں مارکسی نظریات کو پھلنے پھولنے کا موقع تو ملا، کہ ایک وسیع تعداد میں عوام مارکسی فلسفے، غیر طبقاتی سماج کی خواہش اور منظم جماعت قائم کر سکیں، مختلف لائبریریاں اور سٹڈی سرکل بنا کر دیہات جا کر شعور اور علم کی فراہمی میں مارکسی کردار سرگرم رہے، لیکن ان کو محنت کے خاطر خواہ ثمرات نہیں مل سکے۔ مارکسیت پسندوں کی کاوشوں اور کوششوں کو گمان میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ابتدائی طور پر ہم نے سوچا کہ اپنے سیاسی اظہار میں یکسانیت پیدا کی جائے۔ ہم نے نہ صرف یہ کہ مارکسی قوتوں سے اتحاد کے بارے میں سوچا' بلکہ ان قوتوں کے ساتھ بھی اتحاد کے دائرے کو وسیع کرنا چاہا جو ملک کی عمومی صورت حال میں ہمارے ساتھ مل کر ایک مؤثر قوت بن سکیں۔ اپنی سہ رخی پالیسی کے مطابق ہم ان لوگوں سے اتحاد کرنا چاہتے تھے جو سامراج دشمن بھی ہوں اور قومیتوں کے حقوق کے لیے بھی لڑ رہے ہوں۔ اور اس اتحاد میں اس میں ہم مزدور طبقے کے ہراول دستے کے طور پر سرگرم عمل رہیں۔ اس مقصد کے تحت ہم نے کچھ قوم پرست پارٹیوں کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ اور اپنے سیاسی فرنٹ کو اس میں مدغم کر دیا۔ اب ہم اس اتحاد کو وسیع تر کرنے کے لیے کوشاں ہیں تا کہ کوئی شخص بھی' جو ہمارے موقف سے قریب ہے' ہماری صفوں سے باہر نہ رہ جائے۔ (۱۷)

ناول گمان اور اے غزالِ شب اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ناول ہیں۔ ان میں مارکسی نظریات اور پاکستانی سماج میں ہونے والی تبدیلیاں، جو کسی سماج میں بڑی اجتماعی تبدیلی کی وجہ بنتی ہیں، ناول کے کسی ایک کردار کا المیہ نہیں ہیں۔ بلکہ سماج میں پھیلے ہوئے سینکڑوں کا مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ان ناولوں میں بنیادی پہلو جو منفرد ہے اور خاص اہمیت رکھتا ہے وہ یہ کہ اس میں ان افراد کو زیر موضوع لایا گیا ہے جو کہ ایک مارکسی نظریے کو سچائی سمجھ کر دنیا کو اس کے تحت تبدیل کرنا چاہتے ہیں ان سماجی ناہمواریوں کو حل کرنے کا واحد نسخہ ''داس

کیپیٹل' کو سمجھتے ہیں۔ان کی سرگرمیوں کو پاکستان اور روس کے ماحول میں دیکھا گیا ہے۔اردو ناولوں میں یہ دونوں ناول بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ اس سے پہلے اشتراکیت کے نظریے کے اتار چڑھاؤ،نشیب و فراز کو کسی صاحب بصیرت نے ناول کا خصوصی موضوع نہیں بنایا۔

یہ ناول خود مارکسی نظریات اور تصورات کی ترجمانی کا ثبوت ہیں۔

ب: گمان اور اے غزالِ شب میں مارکسی تصورات کی پسپائی

گمان اور اے غزالِ شب میں مارکسی سماج اور پاکستانی سماج کو موضوع بنا کر بائیں بازو کی تحریک کا اتار چڑھاؤ بیان کرتے ہوئے تاریخی حقائق کی روشنی میں لکھے گئے ناول سامنے آتے ہیں۔یہ دونوں ناول اپنے موضوعی اعتبار سے،کرداروں کے لحاظ سے،المیوں اور مسائل کے لحاظ سے بہتاہمیت کے حامل ہیں۔قاری ان کے اثر سے بچ نہیں پاتا۔ان ناولوں میں کرداروں کا المیہ،کرداروں کے ہاں فکری تضادات اور اپنے نظریے ے لیے مذہب،وطن،رنگ اور نسل کی پرواہ کیے بغیر ایک فکری طور پر بغیر جلاوطنی کے وطن کو خیر باد کہتے ہوئے غیر طبقاتی سماج اور مزدوروں کی سلطنت کا خواب دیکھنے والوں کا المیہ و کرب بیان کیا گیا ہے۔فوجی آمریت اور سخت گھٹن پاکستانی سماج میں مارکسی تصورات کا سفر شروع سے رواں دواں رہا ہے۔حالانکہ قیام پاکستان کے بعد جاگیر دار طبقہ اور مفاد پرست اشرافیہ نے ہمیشہ کے لیے سامراج مخالفت کرنے والوں نے طبقاتی تقسیم کے بارے میں شعور دینے والوں کے خلاف پروپگینڈے اور سازشیں کر کے ان پر غداری کے الزامات اور جیل میں قید،اور عوامی چوک پر پھانسیاں دی گئی ہیں۔لیکن فکر اور نظریہ کسی پھانسی یا قتل رشہید کرنے سے ختم نہیں ہوتا۔فوجی دور میں ہر ڈکٹیٹر نے ہمیشہ مارکسی کرداروں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے چاہے وہ جنرل ایوب ، جنرل یحیٰی یا جنرل ضیاء ہی کیوں نہ ہوں۔مارکسی تصورات تیسری دنیا میں خصوصاً پاکستانی سماج میں اس لیے کامیاب نہ ہو سکے کہ سوویت یونین کی طرف سے ان کی بھرپور پشت پناہی نہ ہو سکی اور نہ ہی سوشلسٹ ممالک میں آپس میں وہ اتفاق و اتحاد نہ تھا جو سرمایہ دارانہ ممالک میں موجود تھا۔دوسرا سوویت یونین کے اندر سٹالن کی آمریت اور دانشوروں پر ظلم و ستم بھی ناکامی کی ایک وجہ بنی۔لیکن آپس میں اتفاق و اتحاد کا فقدان اس ناکامی کی بڑی وکلیدی وجہ سمجھا جاتا ہے۔اس کا اظہار گمان میں یوں ہوا ہے:

> جب گلی میں الاندے کی حکومت کا تختہ الٹا گیا تو ایک بین الاقوامی کانفرنس میں روس پر الزام لگایا گیا کہ بحیثیت 'مدر پارٹی' کے اس نے تیسری دنیا کے ایک ملک میں انقلاب کی کامیابی

سے دفاع کیوں نہیں کیا۔سوویت یونین نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور برزنیف نے اعلان کیا کہ ''اب کوئی دوسرا چلی نہیں ہوگا'' اس لیے جب افغانستان کے انقلاب کو سی آئی اے (CIA) نے ناکام بنانا چاہا تو روسی افواج کو حرکت میں آنا پڑا۔ یہ انقلابی فریضہ تھا جس طرح تمام سرمایہ دار ممالک ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں اسی طرح سوشلسٹ انقلاب کے تحفظ کے لیے بھی سارے سوشلسٹوں کو اکٹھا ہونا چاہیے۔(۱۸)

ہر عروج کو زوال ہے اور ہر زوال کو عروج ہے یہ ایک مشہور کہاوت ہے۔ایک زمانہ تھا کہ سوویت یونین (USSR) میں غیر ملکی مارکسی کرداروں کو بہت عزت سے دیکھا جاتا تھا بلکہ ان کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے دعوت نامے ملتے تھے۔لیکن سقوطِ سوویت یونین کے ہوتے ہی ان غیر ملکی کرداروں کو گالیاں اور ان سے بدتمیزیاں سامنے آنے لگیں۔اس کا بیان اے غزالِ شب میں مستنصر حسین تارڑ کے الفاظ میں کیا ہے:

سوویت یونین کے دھانچے میں دراڑیں آئیں اور پھر وہ اپنے قدموں پر مسمار ہوا تو اس کے ساتھ ہی ظہیر الدین کا وجود اور عظیم مساواتی تصور بھی ڈھے گیا اور وہ گویا ایک عظیم کھنڈر کے درمیان تنہا کھڑا رہ گیا کہ اب میں کہاں گھر بناؤ.. یہاں سے کدھر جاؤں..گالینا جو اس کے تصوراتی مثالی جہان کے خواب کی پرجوش رفیق تھی، وہ بھی بہت بودی نکلی، اس کا ساتھ نہ دے سکی..اس نے کیسے ان ابتدائی ایام میں اسے ایک رومان آلود لہجے میں پنجابی کے کچھ فقرے سکھائے تھے کہ کہو..مینوں تیرے نال پیار ہو گیا اے..اور گالینا اس فقرے کو اتنے درست تلفظ سے ادا کرتی کہ اس پر ایک پنجابی مٹیاری کا گمان ہوتا.. پر اب وہ سب کچھ بھول بھال چکی تھی..وہیل چیئر میں ڈھیر یوکرین کی واڈکا کے اتنے گہرے گھونٹ بھرتی اسے روسی میں لعن طعن کرتی رہتی، اسے کوستی رہتی..وہ اسے کیسے موردِ الزام ٹھہراتا کہ ان طویل برسوں مین اس نے سوائے اس دو کمرے کے تنگ فلیٹ، ایک غسل خانے، مسلسل تنگ دستی اور دو بچوں کے سوا اسے اور کیا دیا تھا..(۱۹)

ناول گمان میں ۶۰ کی دہائی کے حالات واقعات خصوصاً آمریت کے دور میں پیدا ہونے والی بے چینی کی اور بے یقینی کی فضاء اور پاکستان کی بائیں بازو کی تحریک کا نشیب و فراز زمینی حقائق کی روشنی میں بیان ہوا ہے۔کہ

کس طرح طرح ڈکٹیٹروں نے مارکسی لٹریچر پھیلانے والوں کو تشدد اور جبر کا نشانہ بنایا۔ عوامی چوک میں عبرت کے لیے، خوف و ہراس کی فضا کو پھیلانے کے لیے لاہور میں پھانسیاں دی گئیں۔ کچھ ادیبوں کو این جی اوز نوکریوں کی لالچ اور دیگر بہت ساروں کو نظر بند اور جیلوں میں قید کیا گیا۔ ان حالات کی عکاسی یا بیان کا اظہار ناول گمان میں مصنف ارشد وحید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> میں سوچ رہا ہوں، جمال بولا۔ ان میں اپنے شہر راجن پور ہی شفٹ ہو جاؤں گا۔ وہاں مقامی سیاست میں حصہ لوں گا۔ اس اتنے بڑے زون کو میں صحیح طور پر نہیں چلا پا رہا۔ اپنے شہر میں رہنے سے کچھ مالی حالات بھی بہتر ہو جائیں گے۔ ویسے بھی لگتا ہے کہ میں کچھ تھک سا گیا ہوں، جمال چارپائی پر دراز ہو گیا اور آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے نیند آ گئی۔ (۲۰)

اے غزالِ شب میں مارکسی تصورات کی پسپائی کا ذکر زیادہ بلکہ اشتراکیت کا نوحہ اور نئے روس (نئے سرمایہ دارانہ نظام) کے ماتم کی صدا سمجھا جا سکتا ہے۔ پورے ناول پر ایک مسلسل اداسی کی کیفیت طاری ہے۔ یہ اداسی فرد واحد کی نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب یا فکر کا زوال ہے۔ اشتراکی انقلاب کے بکھرنے سے آنے والے نظام میں جو بادشاہ بن گئے ان کی قیادت میں دنیا کو فحاشی، پوپ میوزک، اور نفسانفسی کے سوا کچھ بھی نہ دیا۔ جب ایک بڑی تہذیب یا فکر زوال کا شکار ہوتی ہے عروج پر آنے والے تہذیب یا فکر پہلے والی تہذیب یا فکر کو کوڑے دان میں پھینک دیتی ہے۔ اے غزالِ شب کو پڑھتے ہوئے یہ شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ رد انقلاب کے بعد علم و ادب کو شدید نقصان پہنچا۔ یہ صرف ایک سپر پاور کی شکست نہیں بلکہ دراصل دنیا پر ایک ایسا نظام مسلط ہو گیا جہاں صرف مفاد اور جنس پرستی کے سوا کچھ نہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے بڑی خوبصورتی سے ان حالات کا عالمی منظر نامہ پیش کیا ہے:

> جب کوئی عظیم تہذیب زوال پذیر ہوتی ہے.. ایک نظام سرنگوں ہوتا ہے، ناکارہ اور بیکار کو کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے تو اس تہذیب اور نظام کے جتنے بھی کل پرزے ہوتے ہیں ان کے سوا جو گرگٹ کی مانند رنگ بدل لیتے ہیں، وہ سب بھی ناکارہ اور بیکار ہو جاتے ہیں، اور ان کی جگہ نئے لوگ آ جاتے ہیں.. حکومت میں ثقافت اور صحافت یہاں تک کہ ادب اور مصوری میں بھی.. جیسے سٹیٹ ٹیلی ویژن پر اپنے فرائض سرانجام دینے

والے جتنے بھی پروڈیوسر یا ڈرامہ نویس تھے وہ پارٹی کی ہدایت اور مارکس اور لینن کے خیالات اور تحریروں سے آگہی کے انور حاصل کر کے اس کی روشنی میں مزدوروں اور دہقانوں کی حکمرانی کے سرخ سویرے اپنے ڈراموں میں تشکیل دیتے تھے جن کے ہر منظر میں انقلابی گیت الاپتی ہمہ وقت مسکراد ہقانی عورتیں اور درانتیاں فضا میں بلند کیے ہوئے مضبوط بدن مزدور ہوا کرتے تھے اور ان کے پس منظر میں ہمیشہ اسی سرخ سورج طلوع ہو رہا ہوت اتھا.. یہ سب ہدایت شدہ تصورات ان کے خون میں ہوں گردش کرتے تھے کہ اگر وہ کرنا بھی چاہتے تو ان کی روگردانیں ہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ بھی ناکارہ اور بیکار ہو گئے.. ان کی جگہ جو نئے سامنے آرہے تھے، وہ نئے نظام کی ترجمانی کرتے تھے..وہ امریکی مزاحیہ شوز یعنی سٹ کام زکو روسی زبان میں ڈھال کر پیش کرتے تھے..امریکی پاپ سٹارز کو نمایاں کرتے تھے، میڈونا کی چھاتیاں ابھی تک اتنی مستحکم اور بھری ہوئی کیوں ہیں اس پر تحقیقی تجزیئے پیش کرتے تھے..روسی عوام بھی کسانوں، مزدوروں، کدالوں، ہتھوڑوں، درانتیوں اور عظیم باپوں سے اکتا چکے تھے اور وہ ''بے واچ'' جی تقریباً برہنہ خواتین کی بے حیائی کے شیداء ہو رہے تھے..(۲۱)

ناول گمان میں مارکسی تصورات کی پسپائی کی مختلف وجوہات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسے تمام سوشلسٹ ممالک کے اتحاد کا فقدان، پاکستانی سماج میں فوجی آمریت اور انڈیا پاکستان میں جنگیں، بار بار مارشل لاء، مشرقی پاکستان کی علیحدگی وغیرہ۔لیکن اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مفاد پرست طبقہ اس تحریک سے بھی وابستہ رہا۔جن کو ابن الوقت بھی کہا جا سکتا ہے۔فکری ونظریاتی طور رکمزور افراد جو صرف نوکریوں کے لیے اس تحریک سے وابستہ رہے۔اس تحریک کی خوش قسمتی یہ رہی کہ بائیں بازو کو ہمیشہ قابل انسان اور کارکنان بھی میسر آتے رہے۔لیکن گمان میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ تر عوامی سطح تک علمی شعور اور عملی تربیت کے مسائل آڑے آتے رہے۔بائیں بازو کی تحریک سے وابستہ افراد کی رسمی طور پر وابستگی تحریک کی ناکامی کی وجوہات میں سے ایک تھی۔ آپس کی گروہ بندی، پسند و ناپسند، اپنے خیالات ونظریات کو واضح طور پر نہ پیش کر سکنا وغیرہ۔بائیں بازو کی تحریکا یک نئے نظام کو رائج کرنا چاہتی تھی جس کی عکاسی گمان میں یوں کی گئی ہے:

تھوڑی دیر میں ہی وہ تیار ہو گیا۔ وہ دونوں باہر نکلے اور ماڈل ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گئے۔
'یار عملی کام کی بہت ضرورت ہے، جبار موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا۔' نظریاتی سطح پر ابھی بہت کام کرنا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے عام لوگوں کے تصورات بہت سطحی ہیں۔ مارشل لاء کے ایک ہلے سے بہت کچھ ڈھے گیا ہے۔ لوگ اپنے مقام پر کھڑے نہیں رہ سکے۔ اپنے ترقی پسند ہونے پر معذرت خواہ ہیں۔ خیالات کو بڑا لپیٹ کر پیش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ فکری سطحیت ہے جو اپنی سچائی کو مضبوط نہیں کرتی۔ ضرورت ہے زیادہ قوت سے اپنے نظریات بیان کئے جائیں بغیر ان پر کوئی لبادہ اوڑھائے۔ بغیر ان کی مذہبی تاویلات کے۔ صاف اور براہ راست بات کہنی چاہیے۔ اسی طرح بائیں بازو کا کلچر مضبوط ہو گا اور ملکی سیاسن میں ان کی واضح شناخت ہو گی'۔۔۔ جبار موٹر سائیکل پر بیٹھا انہی موضوعات پر اس سے گفتگو کرتا رہا۔ (۲۲)

اے غـــزالِ شـــب میں مارکسی تصورات کی پسپائی کا مکمل اظہار ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت کا بیان ہے جو شعوری طور پر مصنف کی تخلیق کا حصہ بنا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ہمیشہ سے مذہب کو ہتھیار بنا کر استعمال کرتا رہا۔ سوویت یونین کے قیام کے ساتھ کلیسا کو بالکل ایک طرف کر دیا گیا اور مذہب کو انسان کا ذاتی فعل اور اس کی پیروی کو ذاتی عمل قرار دیا گیا۔ کیونکہ سوویت یونین میں زارشاہی کی یہ باقیات رکھنے کا کوئی بھی قائل نہیں تھا۔ اسی کلیسا کو بنیاد بنا کر بالخصوص یورپ میں عوام کا استحصال کیا جاتا رہا۔ جیسے ہی روس میں قائم اشتراکی نظام پر زوال آیا، تو سرامایہ داریت نے ایک مرتبہ پھر مذہب کو ہتھیار بنا کر لینن اور اینگلز کے مجسموں کو پگھلا دیا۔ ان کی جگہوں پر صلیب کے نشانات آویزاں کیے گئے تا کہ عیسائیت کا فروغ ہو سکے۔ ظاہری طور پر مارکسی نظریات کے حامی افراد اگرچہ نئے نظام کے ساتھ سمجھوتہ کر بیٹھے لیکن اس کے باوجود ان کی بڑی تعداد نے کلیسا کی طرف رجوع نہ کیا۔ کیونکہ تاریخ انسانی میں ظلم و جبر کا ایک طریقہ مذہب ہی رہا ہے۔

اے غزالِ شب میں مستنصر حسین تارڑ اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

سوویت یونین کے انہدام پر عیسائیت جو کسی کونے کھدرے میں پوشیدہ اچھے وقتوں کی منتظر تھی، یکدم نمودار ہو گئی تھی.. درانتی اور ہتھوڑے پر صلیب غالب آنے لگی.. جیسے کسی سرمئی

بارش کے بعد برچ کے جنگلوں میں راتوں رات کھنب اگ آتے ہیں ایسے میں پورے روس میں نئے کلیسا اگنے لگے تھے یہاں تک کہ پیوٹن..کے جی بی کا نظریاتی طور پر کٹر کمیونسٹ اور ملحد ایجنٹ..ان دنوں زرق برق شاہانہ لباس لاٹ پادریوں کے سامنے جھکا ان کے لبادوں کو عقیدت سے بوسہ دیتا مذہب کے لئے وارفتگی کا اظہار کرتا تھا..لیکن نہ تو گالینا ہی اپنے آبائی مذہب کی جانب پلٹی اور نہ ہی بورس اور سویٹ لانا کو عیسائیت سے کچھ رغبت پیدا ہوئی، وہ بدستور ایک آزاد اور ملحد ذہن کے بغیر کسی احساس جرم کے روس کے نئے سرمادارانہ نظام میں داخل ہو گئے..(۲۳)

بائیں بازو کی تحریک کو زیادہ نقصان ذوالفقار علی بھٹو کی روشن خیالی سے پہنچا۔ دو ڈکٹیٹروں کے ساتھ اس جاگیردار نے اپنی طرف سے یہاں پاکستانی سماج میں کمیونسٹوں کو اپنے مفاد کے لیے بہت استعمال کیا۔ انقلاب کے حامی ذوالفقار علی بھٹو کے خیالی نعروں میں اور کمیونسٹوں میں زیادہ فرق نہیں کر پائے۔ ایسے میں ایک شخصیت میں انقلاب دیکھتے یہ خسارے کا سودا کر بیٹھے۔ بھٹو کے مشہور نعروں میں چند نعرے جو عوام کی زبان پر ہوتے تھے:

۱۔ اسلام ہمارا دین ہے

۲۔ سوشلزم ہماری معیشت

۳۔ جمہوریت ہماری سیاست

۴۔ طاقت کا سرچشمہ عوام

پاکستانی سماج میں غریب عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان کے مسائل آج بھی درپیش ہیں۔ بھٹو کے ان دلکش نعروں سے متاثر ہو کر کمیونسٹ ایک رومانس میں مبتلا ہو گئے اور بھٹو کی ہم خیالی کا شکار ہو گئے، انہیں جس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ ان حالات و واقعات کا بیان گمان میں ان مکالموں کی صورت میں ملتا ہے:

'جب تک لوگ پیپلز پارٹی کے خواب سے نہیں جاگتے' اس وقت تک اس ملک میں حقیقی انقلابی تبدیلی بہت مشکل ہے۔' نور ملک کہنے لگا 'ان لوگوں نے ضیاء حکومت کو ایک ذاتی مسئلہ بنا لیا ہے۔ سیاست ایک ذاتی انتقام نہیں ہے۔ یہ تو پورے نظام کو بدلنے کا مسئلہ ہے۔

کسی ایک ٹولے کے جانے اور دوسرے کے آ جانے سے تو مسائل حل نہیں ہوں گے۔(۲۴)

اے غـــزالِ شـــب میں پسپائی کے عناصر کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے عارف نقوی کے کردار کے ذریعے بتایا ہے کہ تمام کردار سوویت یونین کا وظیفہ حاصل کرنے کے بعد وہاں تعلیم مکمل نہیں کرتے۔لیکن وہاں لگے ہاتھوں شادیاں رچا لیتے ہیں۔روسی معاشرے نے ان کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب، رنگ، نسل کو چھوڑ کر ایک کمیونسٹ سماج میں ان کی تشکیل کو سراہا بھی،لیکن اشتراکیت کے انہدام کے ساتھ ہی یہ کردار غیر اور مجرم دکھائی دینے لگے۔ عارف نقوی ہمیشہ سرخ رنگ کے کپڑے پہنتا کیونکہ اسے اس رنگ سے محبت ہے۔ عارف ہمیشہ پرانے البم اور یکم مئی کو لینن گراڈ کی یادیں تازہ کرنے کے لیے پرانی تصاویر دیکھتا رہتا ہے۔ حالانکہ ان کی اہلیہ انہیں پرانی یادوں سے نکلنے اور حقیقی دنیا کے ساتھ چلنے کا مشورہ دیتی ہیں۔عارف جو دیوار برلن کے گرا دیے جانے کو ایک بڑا سانحہ مانتے ہیں۔عارف نقوی نئے نظام کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے خلاف اور ایک نظریاتی شخص ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔عارف نقوی مرتے دم تک نئے نظام (جمہوری روس) کے خلاف مزاحمت کرتا نظر آتا ہے۔

اس کا بیان یوں ملتا ہے:

> عارف نقوی اس بین الاقوامی اکھاڑ پچھاڑ کی زد میں آ کر زائل ہو رہا تھا، اُس کی اِس دنیا میں موجودگی کے آثار ملیا میٹ ہو رہے تھے..نہ صرف اس دنیا بلکہ نظریات ءوابستگی کے جہان میں بھی اس کے سارے نشان پہچان مسمار ہو چکے تھے..سوویت یونین کے یوں منظر سے تحلیل ہو جانے پر وہ بے آسرا ہو گیا تھا..انہی دنوں اسے اپنا لکھنؤ اور کراچی شدت سے یاد آنے لگے تھے..(۲۵)

ناول گـــمـــان میں بائیں بازو کی تحریک کے تضادات باہمی گروپ بندی اور پاکستانی سماج میں مارکسی تصورات کی پسپائی کے اسباب بیان ہوئے ہیں۔اس سوشلسٹ تحریک میں ایک الگ تنظیم تھی جو تحریکِ عوام کے نام سے الگ کام کر رہی تھی۔لیکن یہ تحریک مختلف طبقات اور گروپ بندی کا شکار ہو گئی۔اس کی عکاسی گـمـان میں یوں کی گئی ہے:

> تحریک عوام ایک دفعہ پھر ٹوٹ گی تھی۔ بائیں بازو کے اتحاد کو وسیع تر کرنے کی خاطر جو

اقدامات کیے جا رہے تھے...ان پر اختلافات شدید ہو گیا تھا۔اب ایک گروپ نے نئے اتحاد سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کیا تھا جبکہ دوسرے ہم خیال لوگوں نے نئے گروپ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔(۲۶)

اے غزالِ شب کے تمام کردار پر مایوسی اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ پڑھتے وقت احساس ہوتا ہے کہ کردار نظریات جذباتی وابستگی رکھتے ہوئے چیزوں کا تجزیہ کر رہے ہیں۔عارف نقوی ایک ایسا ہی کردار ہے ان کے لیے دیوار برلن کا گرنا ایسا ہی جیسے واقع کربلا میں یزید کا ظلم اور اپنے جیسے نظریاتی افراد کو بے بس اور مظلوم تصور کرنا۔ عارف نقوی مزاحمتی شاعری کے اثرات سے نہیں بچ سکا۔ اے غـــزالِ شـــب میں مارکسی تصورات کی پسپائی ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

نہ تاج اچھالے جا سکے، نہ تخت گرائے جا سکے اور نہ ہی خلقِ خدا راج کر سکی..صرف سرمایہ داری کا خدا یزید کی صورت میں ظاہر تھا جو کہ اول بھی تھا اور آخر بھی..اس کیا ور ہلڑڈ کی کی واحد ذاتی جائیداد یہ ایک بیڈ روم کا فلیٹ تھا جو برلن کے اس قدرے سرسبز نواح میں کثیر المنزلہ عمارت کے ہجوم میں کسی ایک عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا اور وہاں رات گئے تک روشنی رہتی..(۲۷)

گمان ناول میں پاکستانی سماج میں مارکسی تصورات کی پسپائی اور یہاں کے لوگوں میں باہمی اختلافات اور تضادات کو بیان کیا ہے۔علاقائی اور نسلی تعصب کو بنیاد بنا کر اس تحریک کو اندر ہی اندر نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ گمان میں مصنف نے ان کرداروں کی آپس میں رسہ کشی کو پیش کیا ہے۔ارشد وحید لکھتے ہیں:

بعد میں پتہ چلا کہ مولویوں کی ان میں بھی کمی نہیں ہے۔ان لوگوں کے بیہودہ ڈسپلن سے جب میں باغی ہوتا' تو کچھ لوگوں کو میں نے کہتے سنا' اکثر نے میرے بارے میں کہا۔'' بھئی وہ تو ہے ہی بداصلا۔اس سے خیر کی کیا امید رکھیں۔۔۔کامریڈ نقاش نے پارٹی چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔(۲۸)

اے غزالِ شب میں مارکسیت کے ماضی اور حال کو ایک ہی تسلسل سے بیان کیا ہے۔اور اس تسلسل سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک عظیم تہذیب یا فکر کا زوال دراصل فردِ واحد کی ناکامی نہیں بلکہ تاریخ

میں ایک سیاہ باب کا اضافہ ہے۔روس کے عوام کس قدر جذباتی ہوتے ہیں اس کا اندازہ ہمیں زار شاہی کا تختہ الٹنے سے ہوسکتا ہے۔یہ وہی روسی تھے کہ جو USSR میں آنے والوں کو خوش آمدید کہا کرتے تھے لیکن سقوط کے فوراً بعد ان کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرنے لگے۔وہ حساس لوگ جو ایک نظریاتی وفکری سفر کے لیے اپنا وطن چھوڑ چھاڑ کر ایک مساوی سماج کی خواہش لے کر آئے تھے،انہیں اس طرح کے رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔

''حرامی غیر ملکی..ہماری عورتوں کو خراب کرنے والے..گو بیک..تم سؤر..غیر ملکی..''

''میں روسی ہوں..میں''

''باسٹرڈ..''

جب وہ ڈولتا لڑکھراتا ایک خون آلود چہرے کے ساتھ فلیٹ میں داخل ہوا تو گالینا نے اپنی وہیل چیئر سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بے اعتنائی سے کہا''ظاہیر..میں نے تمہیں خبردار کیا تھا..تم اب سوویت یونین میں نہیں ہو..ایک آزاد جمہوری روس میں ہو..میں نے تمہیں خبردار کیا تھا۔(۲۹)

گمان ناول کو یہاں پاکستانی سماج میں بائیں بازو خصوصاً کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کے اتار چڑھاؤ کی روداد قرار دیا جاسکتا ہے۔کمیونسٹوں نے پاکستانی گھٹن زدہ ماحول میں علمی ماحول بنانے کے لیے مختلف دیہاتوں اور شہروں میں لائبریریاں اور اسٹڈی سرکل بنائے۔اس تحریک میں بہت سارے ایسے نظریاتی کارکنان بھی تھے جو سماج میں رہتے ہوئے دوسروں کو لیے عملی طور پر کام کر رہے تھے حالانکہ اس دور میں نو دولتہ (اشرافیہ بننے کا عمل) جاری تھا۔لوگ نوکریوں کی تلاش میں تھے جبکہ یہ مارکسی کردار آنے والی نسلوں کے بارے میں اس قدر سنجیدہ تھے کہ اپنے گھر بار چھوڑ کر عوام کی خدمت اور عوام کے حقوق کے لیے جنگ جاری رکھے ہوئے تھے۔ملک میں مارشل لاء اور جبر سے تنگ آ کر سماجی ناہمواریوں کو ختم کرنے کی نہ صرف خواہش رکھتے تھے بلکہ اس کے حصول کے لیے عملی کوششوں میں بھی مگن تھے۔لیکن یہ مخلص کارکنان بھی تحریک سے وابستگی کے باوجود ابن الوقت جیسے کردار کی طرح وقت کے تقاضوں کو مطابق تبدیل ہوتے گئے۔بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس تحریک سے وہ لوگ جڑے تھے جو ذاتی طور پر ظلم و جبر کا شکار رہے اور اس کے خلاف لڑنا چاہتے تھے اور سرمایہ داری وجاگیرداری کی طوائف بننا پسند نہ کرتے تھے،لیکن ان میں وہ افراد بھی شامل تھے جو ہوا کے دوش پر کسی بھی سمت سفر کرنا پسند کرتے تھے۔ناول گمان میں ان

حالات کی عکاسی یوں ملتی ہے:

''عمر ہی برباد کی یہاں'' اگر پیپلز پارٹی کے ساتھ رہتے۔ کچھ کے کچھ بن چکے ہوتے۔ میں جتنا کام کرتا تھا اس کے لیے مجھے بڑے تنظیمی سکیل کی ضرورت تھی۔ ایسے ہی ان چھوٹی چھوٹی تنظیموں میں عمر گنوائی۔ (۳۰)

اشتراکی انقلاب سوویت یونین کے انہدام سے محض ایک بہت بڑی عالمی طاقت (سپر پاور) کا خاتمہ ہی نہیں بلکہ اس سے دنیا کا نظام جو بڑی طاقتوں پر مشتمل تھا غیر متوازن ہو گیا۔ اس نے پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر منفی اثرات مرتب کیے۔ دنیا بھر میں بڑی تعداد میں لوگ دہشت گردی، غیر یقینی صورت حال، جنس پرستی اور فحاشی کے قیدی ہو تر رہ گئے۔ لوگ راتوں رات امیر کروڑ پتی بنے، اس کے برعکس ایک کثیر تعداد میں لوگ بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہوئے۔ علم و ادب کے میدان میں بھی زوال چلا آیا۔ اس کا اندازہ ناول کے ایک کردار سے لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے روس کی ایک خاتون لیکچرار جسم فروشی کے لیے پاکستان کی سرزمین کا رخ کرتی ہے۔ اے غزالِ شب میں مارکسی تصورات کی پسپائی کا کرب تارڑ اتنی عمدگی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مستنصر حسین تارڑ نے علمی میدان کے نقصان اور زوال کو موضوع بناتے ہوئے لکھا ہے:

جونہی ایک سرخ سویرے کی جگہ ایک سرمایہ دارانہ ڈالر سویرا طلوع ہوا تو خلائی تسخیر کے ادارے.. سائنسی تحقیق کے منصوبے.. فنون لطیفہ کی ترویج ایسے خسارے کے سودے کوڑے دان میں پھینک دیئے گئے کہ ان میں مالی منفعت نام کو نہ تھی.. یہ کارِ لاحاصل تھے جن کے ذریعے صرف قومی فخر اور عزت نفس کی تشفی ہو سکتی تھی.. ایک آزاد اور جمہوری معیشت کا خاصا ہے کہ دولت حاصل کرنے کے لیے اس کا کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں ہوتا چنانچہ انسانی گوشت کی برآمد اگر منافع بخش ثابت ہو سکتی تھی تو یہ بہترین معیشت تھی.. اس صنعت نے سوویت یونین کے انہدام کے بعد دن دونی رات چوگنی کہ یہ صنعت راتوں کو ہی عیاں ہوتی تھی، ترقی کی.. صنعتی بھاری مشینری، زرعی آلات اور ٹریکٹر.. کاریں اور ہوائی جہاز اور دیگر مصنوعات اگرچہ نہایت بھدے لیکن مضبوط جو سوویت یونین کے زمانے مین باعث افتخار تھے، ان کی جگہ روس کی سب سے منافع بخش صنعت.. نسوانی بدنوں کی برآمد نے لے لی.. (۳۱)

گمان میں مارکسی تصورات کی پسپائی کا سبب جہاں فوجی آمریت اور بار بار آنے والا مارشل لاء تھا ، پاکستان انڈیا کی جنگیں تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑا تضاد اس تحریک کا مختلف گروپوں میں تقسیم ہونا، ایک دوسرے کے گریبان پکڑنا، ایک دوسرے پر الزامات عائد کرنا بھی تھا۔ اس طرح اس تحریک میں یہ خلا پیدا کی گئی جس سے بائیں بازو کی یہ سرگرم کمیونسٹ قومیت اور نسلی برتری کے گرفتار ہو گئے اور رفتہ رفتہ ان کا حاصل کردہ سب کچھ ختم ہونے لگا۔ گمان میں اس کا تذکرہ یوں ملتا ہے:

> کراچی سے واپسی لاہور آئے ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ گزشتہ دو دن سے وہ کہیں نکلا نہیں تھا۔ پارٹی میں چھائی ہوا گزشتہ عرصے کا غبار اب چھٹ رہا تھا' لوگ واضح طور پر دو گروپوں میں تقسیم ہو رہے تھے۔ گو بظاہر ایسا کچھ نظر نہیں آتا تھا، مگر دبے لفظوں میں لوگ ایک دوسرے پر سنگین الزامات لگا رہے تھے۔ اگر لوگ اتنے ہی گھٹیا ہیں' تو اب تک یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ لوگوں کی جدوجہد کس لیے؟ اور اگر محض آپس کی مخالفت کی وجہ سے کیا جا رہا ہے تو یہ سب کچھ اتنا سطحی ہے کہ اس کے جاری رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ مگر شاید ہو۔ آخر ہم لوگ بھی تو عام' زندگی سے آتے ہیں۔ جس میں ساری کج رویاں ہوتی ہیں اور' ہمارے رویئے کسی حد تک ان کے عکاس ہوتے ہین۔ اسی طرح لوگ تضادات سے نکل کر ابھرتے ہیں اور نئی شکلیں ترتیب پاتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ ایک خط مستقیم میں تو نہیں ہوتا۔ 'کن فیکون' سے تو نہیں ہوتا۔ اسی کشمکش سے نئی تصویر کے خدوخال ابھرتے ہیں۔ وہ گزشتہ دنوں یہی کچھ سوچتا رہا۔ مختلف باتوں کے جواز ڈھونڈتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کے حواس جواب دے گئے۔ (۳۲)

اے غزالِ شب میں مارکسی تصورات ونظریات کی پسپائی کے بعد کی صورت حال اس قدر سنجیدگی سے بیان ہوئی ہے کہ کرداروں کے ذریعے نئے روس کے بدلنے سے جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ان کا بیان زمینی حقائق کی روشنی میں نظر کیا گیا ہے۔ اے غزالِ شب میں مارکسی تصورات کی پسپائی کے بعد جنس پرستی اور پوپ میوزک کا راج اور سرمایہ دارانہ نظام سے تمام دنیا مذہب کے کھوکھلے نعرے ایک خاص پس منظر کے ذریعے بیان ہوئے ہیں۔ سوویت یونین کے بکھرنے سے پہلے عوام کی رسائی ہر چیز تک تھی لیکن انہدام کے بعد معیشت پر چند لوگ قابض ہو

گئے۔ وہ لوگ جو سوویت یونین میں نوکر تھے نئے روس کے بادشاہ بن گئے۔ سوویت یونین میں انصاف، عدل نہ سہی لیکن ایک عام انسان کی رسائی ممکن تھی۔ ردانقلاب کے بعد لینن کے مجسمے گرادیے گئے اور ان کی جگہ صلیبوں نے لے لی۔ عیسائیت کا پرچار سابقہ ملحدانہ نظام کو چلانے والے ملحد کرنے لگے۔ لیکن دراصل سرمایہ دار اپنی معیشت چمکانے کے لیے یہ سب کررہے تھے۔ لے غزالِ شب میں یہ دکھایا گیا کہ انقلاب کے بعد سرمایہ دار نے سوویت یونین میں مارکسی انقلاب کی باقیات کو کس صفائی سے ختم کیا کہ اس کا کوئی نشان بھی نہ بچ پائے۔

ظہیرالدین کی بیٹی نئے روس میں جسم فروشی کے ذریعے گھر کا نظام چلاتی، اور جب ظہیرالدین اس کی فحش ویڈیو دیکھتا تو سوچتا کہ کیسے شمس الدین انقلابی اور اس کے بیٹے ظہیرالدین کی عزت پامال ہورہی ہیں۔ اس طرح کے دیگر حالات کو بیان کرنے کرتے ہوئے روسی معاشرت اور وہاں کی تبدیلیوں کو بیان کرتیحقائق سامنے لائے گئے۔ حقائق تلخ سہی لیکن اشتراکی نظریات سے وابستہ افراد کے المیے کا بیان ہے۔

> پھر وہ عظیم معبد تھا سوویت یونین کا جس کے ستونوں کو جب معیشت کے زوال کی دیمک نے یوں کھوکھلا کیا کہ وہ یکدم منہدم ہو گئے اور ان کی جگہ ایک نیا سرمایہ دارانہ نظام سربلند ہونے لگا تو وہ نظام کیسے ہر گلی کوچے اور ہر چوک میں ایستادہ اپنے ازلی دشمن کو ایستادہ برداشت کرسکتا تھا... مزدوروں کی وزارت کا وہی شعبہ جہاں ہمہ وقت یہی منصوبہ بندی کی جاتی تھی کہ پورے سوویت یونین میں کوئی کوچہ، گلی، بازار یا چوک ایسا تو نہیں رہ گیا جہاں سے لینن نظر نہ آتا ہو.. بے شک نظر آتا ہو تو بھی ایک اور مجسمہ کہیں نہ کہیں ایستادہ کردو.. اب اسی شعبے کو انہی مجسموں کو ہٹانے، گرانے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے معمور کردیا گیا تھا، اس تہہ خانے میں صرف ماسکو شہر اور اس کے گردونواح میں سربلند لینن کے جو مجسمے گرائے گئے تھے وہ سب کے سب استراحت فرماتے تھے، اگر وہ سب پتھر سے تراشے ہوتے تو انہیں پیس کر ان کی بجری کوٹ کر سکی نئے کلیسا کی بنیادوں میں بھری جاسکتی تھی.. اگرچہ یہ بجری شرعی طور پر لادین ٹھہرتی تھی کہ ایک لادین شخص کے مجسمے سے بنائی گئی تھی لیکن مقدس کلیسا ہمیشہ ایسے گنہگاروں کے خون سے ہی سرخرو پائندہ ہوتا تھا.. وہ سب پتھر سے تراشے ہوئے نہ تھے ان میں سے بیشتر تانبے سے ڈھالے گئے تھے اور یہ دھات مناسب

قیمت والی تھی..لوہے کا بھی مول پڑ جاتا تھا..(۳۳)

نیز لینن، اس کے مذہب سے متعلق رائے اور اس کے مجسمے کے بارے میں اے غزالِ شب میں ذکر یوں بھی ملتا ہے: ''تاریخ کا یہ کیسا بھیانک قہقہہ تھا کہ مذہب کو افیون قرار دینے والے لینن کے مجسموں سے ساختہ صلیبیں کلیساؤں میں آویزاں ہوں گی۔''(۳۴)

ناول گمان میں ۱۹۸۹ء کے سال کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں سے روس کا افغانستان کی صورت حال اور روس کے حالات کا سیاسی ذکر ملتا ہے خواہ وہ دبے ہوئے الفاظ میں سہی لیکن تحریک کے نشیب و فراز میں ۱۹۸۹ء کے حالات کا بھی ذکر ایک زمینی اور تاریخی حقیقت کے پس منظر میں کیا گیا ہے۔

> '۱۹۸۹ء کا سال بھی گزر گیا' پرویز بولا۔۔۔نہ ہی زندگی' اس دنیا کے نظام پر ہمارا کنٹرول ہے۔بس آ گئے ہیں یہاں' اب محض جینا چاہیے۔ویسے زندگی لوگوں میں جا کر سمجھ آ سکتی ہے۔ یہاں اس کمرے میں نہیں۔تمہارا ہی خیال تھا کہ ہم اس مرحلے پر شکست کھا گئے ہیں۔عالمی سطح پر بھی سوشلسٹ کیمپ تقریباً ختم ہی ہو گیا ہے۔مگر میرا خیال ہے کہ تم نے اس شکست کو ابھی تسلیم نہیں کیا ہے۔(۳۵)

ج: گمان اور اے غزالِ شب میں جنرل ایوب خان اور جنرل ضیاء الحق کا ذکر

ناول گمان ایوب خان کے مارشل لاء کے خلاف مظاہرے سے شروع ہوتا ہے۔ناول گمان میں پاکستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کو پیش کیا گیا ہے۔گمان میں مصنف کے سامنے کوئی چیز، نظریہ، کردار، کہانی واضح نہیں اور اسی غیر یقینی صورت حال کا نام ''گمان'' ہے۔

اے غزالِ شب کا دورانیہ تقریباً پون صدی پر مشتمل ہے۔اس ناول میں فلیش بیک کا تکنیک کا استعمال، ان کے کرداروں کا تعلق پاکستان اور روس بلکہ دنیا بھر کے اشتراکی کرداروں پر محیط ہے۔ اے غزالِ شب کو اشتراکی فکر سے وابستہ افراد کا کرب اور نئے نظام کی خرابیوں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔

دونوں ناولوں نے فوجی آمریت کی سختیاں اور گھٹن زدہ ماحول اور قائم ہونے والے فضاء اور اس سے وابستہ ظلم کو موضوع بنایا ہے۔جنرل ایوب اور جنرل ضیاء الحق نے باقاعدہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بائیں بازو کی

تحریک سے وابستہ افراد کو تلاش کر کے انہیں پھانسیاں دلوائیں۔ان سختیوں کا اظہار مختلف صورتوں اظہار مختلف صورتوں میں سامنے آتا ہے۔قراۃ العین حیدر کا پاکستان چھوڑ جانا اور حسن ناصر اور شمس الدین کی پھانسیاں تاریخی واقعات کی طرف ایک اشارہ ہیں۔

ڈکٹیٹر یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ سماج میں انسان کو علم و شعور میسر ہو۔کیونکہ غیر یقینی کی صورت حال، دہشت، خوف اور نفسانفسی ان کی موجودگی، اقتدار اور حکومت میں رہنے کا جواز پیش کرتی ہے۔وہ اپنے دفاع کے لیے علم و شعور کو چشموں کو پھلنے پھولنے نہیں دیتے۔

پاکستان ڈکٹیٹروں کی وجہ سے مستحکم نہیں ہوسکا۔ایوب خان نے ملک میں ادیبوں اور مزاحمتی ادب پھیلانے والوں کے گرد گھیرا تنگ کیا۔اس دور میں کمینسٹوں میں دھڑے بنائے گئے، کمیونسٹوں کو اٹھایا گیا،اس تحریک پر پابندی لگائی گئی، سرخ رنگ پر پابندی لگائی گئی۔شکاری کتے سرخیوں کے پیچھے پڑے رہے۔کربلا کا استعارہ سرخ رنگ، یہ سرخ ملحد، کمیونسٹ، سرخ انقلاب، سرخ سلطنت کا حصول پابندیوں اور سختیوں کا شکار ہوئے۔اس طرح کی سرگرمیوں میں ایوب خان اور ان کی خفیہ ایجنسی ملوث رہی جس نے انجمن ترقی پسند مصنفین پر لاٹھی چارج کیا،تشدد کا نشانہ بنایا،حسن ناصر کو گرفتار کر کے شاہی قلعے لاہور میں اس قدر ٹارچر کیا کہ وہ شہید ہوگیا۔فیلڈ مارشل ایوب خان کا ذکر گمان میں یوں ہوا ہے:

> فیلڈ مارشل ٹھیک کہتا تھا۔کسی نے اس بات پر توجہ نہ دی۔وہ کہتا تھا بنگالیوں کو پوری روٹی مت دو۔پوری روٹی دی تو یہ تنگ کریں گے۔دیکھ لیا انجام۔پیٹھ میں ہمارے خنجر گھونپا۔یہ سب غداری کا نتیجہ ہے ورنہ ہمیں کبھی بھی شکست نہیں ہوسکتی تھی۔(۳۶)

آزادی ہر کسی کا بنیادی حق ہے یہ کمیونسٹوں کا خیال تھا کہ ہر کسی کو حاصل ہے لیکن فوجی آمریت بنگالیوں کی آزادی کو اپنی توہین سمجھتی تھی بلکہ سمجھتی رہے گی۔کیونکہ کوئی عزت سے زندگی گزارے یہ فوجی ڈکٹیٹر سے برداشت نہیں ہوتا۔ اے غزالِ شب میں بھی جنرل ایوب کا ذکر کچھ اسی طرح ملتا ہے:

> ان زمانوں میں ایوب خان کی خفیہ ایجنسیاں ایسے شکاری کتوں کی مانند تھیں جنہیں ہر طرف سرخ ہی سرخ نظر آتا تھا..وہ سہاگ رات کے سرخ جوڑے میں ملبوس دلہن کو بھی چیر پھاڑ سکتے تھے کہ یہ سرخ لباس تو کمیونسٹ ہے،ملحد ہے اور پاکستان مخالف ہے اور ان کی کچھ پچھ

پڑتیت نہ ہوتی..شیخوپورہ کے طالب علم نے سوویت سفارت خانے کی جانب سے اردو میں شائع ہونے والے رسالے ''طلوع'' کے ایڈیٹر کو کسی مضمون کے بارے میں ایک خط لکھا تو نہ صرف اسے جیل کی ہوا کھانی پڑی بلکہ اس پر تشدد بھی کیا گیا..برسوں بعد آئی ایس آئی کے ایک بریگیڈیئر بلا بڑے فخر سے اقرار کرتے تھے کہ ہاں میں نے سندھ میں کمیونسٹوں اور ان کے حامیوں کا قلع قمع کر دیا کہ ان کے قتل ملکی سلامتی کے لیے جائز تھے تو کیا ایسے حالات میں ایک کمیونسٹ ملک کا سفیر اور وہ بھی غیر قانونی، دانش مندی ہے..؟ (۳۷)

ناول گمان کا آغاز جو ۱۹۶۰ میں آمریت کے خلاف پائی جانے والی غیر یقینی اور بے چینی سے ہوتا ہے تو اس میں صدر ایوب اور جنرل ضیاء کا دور خصوصی طور پر زیر بحث آتا ہے۔ دراصل کسی بھی سخت گھٹن زدہ ماحول میں احتجاج اور مزاحمت کا اظہار وقفے وقفے سے ہوتا رہا ہے۔ گمان میں ارشد وحید تاریخی جبر کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

یہ فوجی حکمران ضیاء الحق کا سخت ترین دور تھا۔ اس سے پہلے ایک طیارے کا اغواء ہوا تھا۔ ملک میں پکڑ دھکڑ عام تھی۔ کوڑے کثرت سے لگائے جا رہے تھے۔ جیل میں بہت سے سیاسی قیدی تھے۔ کچھ کو یہاں کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ کچھ دوسری جیلوں سے یہاں منتقل ہوئے تھے۔ کچھ کو سزا ہو چکی تھی جبکہ باقی اپنے مقدمات کی سماعت کے ختم ہونے یا ان کے فیصلوں کا انتظار کر رہے تھے، جیل میں ایک بیرک سیاسی قیدیوں کے لیے مخصوص کی ہوئی تھی؛ جس میں مختلف پارٹیوں کے لوگ سارا دن بحثوں میں وقت گزارا کرتے۔ ہسپتال سے قریب ہی ایک کمرے کو 'بی کلاس' میں بدلا گیا تھا۔ جہاں تین وکلاء نظر بند تھے۔ شام تک مختلف لوگ ان سے آ کر ملتے گئے۔ کچھ کو وہ پہلے سے جانتے تھے' کچھ کا ذکر سن رکھا تھا' جبکہ باقیوں سے نیا تعارف ہوا۔ (۳۸)

ناول گمان میں ایک جگہ ڈکٹیٹر کے مرنے کا منظر اور عوام میں اس کا ردعمل دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرنے پر خوشی کا اظہار اچھی بات نہیں ہوتی لیکن ایک ایسا عمل ناول میں بیان کرنا ایک مصنف کے مشاہدے کی عکاسی ہے۔ دراصل ڈکٹیٹر عوام کے لیے ایک جبر اور سختی کا ماحول دے کر اذیت اجتماعی معاشرے کو دیتا ہے تو ایسے میں سماج

میں اکثریت کا ردعمل فطری عمل بنتا ہے۔ناول گمان میں یوں ذکر ہوا ہے:

کتنے پیسے؟' اس نے اتر کر پوچھا۔

پیسے ہو گئے نے جناب' ڈرائیور کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا' چلو چھڈو جی رہن دیو۔'

'مگر کیوں؟ کبیر نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

'بس جی اج انج ای چلے گا' ڈرائیور بولا۔

آج کوئی خاص با!'

لو باؤ جی' تہانوں نئیں پتہ قاتل مر گیا جے''

''قاتل؟''

ہاں جی' صدر مر گیا جے' (۳۹)

اے غزالِ شب میں بھی اس طرح کے حالات ہی کا بیان ملتا ہے:

کبھی وہ زمانے تھے جب اس علاقے میں کیا ہی مدھر رونقیں اور حسن کے کاروبار تھے..اور انہی زمانوں مس ٹبی تھانے کے عین سامنے ایک خوش ذوق گلشن نامی طوائف نے اپنے گھر کے باہر اپنی نیم پلیٹ پر لکھوا رکھا تھا کہ.. یہاں آؤ گلشن کا کاروبار گلے..اور پھر مردہ مینڈک کی آنکھوں والے جنرل کے عہد میں یہ سب کاروبار ویران ہو گئے..(۴۰)

د: گمان اور اے غزالِ شب کا بنیادی فرق

۱۔ اے غزالِ شب کا آغاز دلچسپ اور فلیش بیک کی تکنیک سے ہوتا ہے جبکہ گمان کا آغاز تجسس اور روایتی ہے۔نیز عنوان کی طرح غیر یقینی مبہم تصورات کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ اے غزالِ شب میں پورے سوویت یونین کو ایک سیلاب کی حیثیت میں بیان کیا ہے۔ماحول کی عکاسی ، اسلوب، منظر نگاری، کردار نگاری اپنے عروج پر ہے جبکہ ناول گمان میں بائیں بازو کی تحریک مبہم صورت حال اور غیر یقینی صورت حال میں سطحی قسم کے سیاسی نظریات اور تضادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

۳۔ اے غزالِ شب میں مقامی کرداروں کو روس میں اور روسی کرداروں کو پاکستان میں دکھایا گیا ہے۔جبکہ

گمان میں اس طرح کے حالات اور کردار نہیں ملتے۔

۴۔ گمان ناول میں لاہور یونیورسٹی کا تذکرہ ملتا ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح اے غزالِ شب میں دلچسپ انداز سے بیان ہوا ہے۔ وہاں مارکسی نظریہات کے لیے جن مسائل کا بیان اے غزالِ شب میں ملتا ہے اس طرح گمان میں واضح نہیں۔

۵۔ اے غزالِ شب میں پورے سوویت یونین کی شکست کو بیان کیا گیا ہے جبکہ گمان میں چند کرداروں کا بیمار ہو جانا اور ان کی شکست کہانی کا مرکز ہے۔

۶۔ دونوں ناولوں میں صدر ایوب اور جنرل ضیاء کو موضوع بنایا گیا ہے۔

۷۔ اے غزالِ شب میں کیونکہ سقوط کے بعد کا جائزہ لیا گیا ہے اس لیے وہاں لینن کے مجسموں کے انہدام کا ذکر ملتا ہے جو کہ گمان میں نہیں۔

۸۔ اے غزالِ شب میں مارکسی کرداروں کا اپنے نظریے پر قائم رہنے اور نئے نظام کے ساتھ مارکسی کرداروں کا سمجھوتہ بیان ہوا ہے جبکہ گمان میں اس قدر وضاحت نہیں۔

۹۔ دونوں ناولوں میں مارکسی تصورات کی شکست کا بیان ہے، فرق صرف پاکستانی سماج اور روسی سماج میں شکست کا ہے۔

۱۰۔ اے غزالِ شب کے کردار ظہیر الدین اور والد شمس الدین مارکسی جبکہ کبیر گمان ناول کا کردار کوئی واضح مارکسی تربیت یافتہ نہیں دکھایا گیا۔

۱۱۔ اے غزالِ شب میں روسی سفارت خانے کا کے پروپیگنڈے کا ذکر موجود ہے جبکہ گمان میں نہیں۔

۱۲۔ دیوارِ برلن کا ذکر گمان میں نہیں جبکہ اے غزالِ شب میں ایک کربلا اور استعارے کے طور پر پیش ہوا ہے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے جس کا ذکر گمان میں نہیں۔

۱۳۔ ناول اے غزالِ شب میں جہاں سوویت یونین کی شکست ہے وہاں ساتھ سرمایہ داری کے خطرات کا

بیان بھی ہے۔اس سرمایہ داری کے علم وادب پر اثرات اور دنیا کے نظاموں میں عدم توازن کو بیان کیا گیا ہے جبکہ گمان میں سرمایہ داری کا کوئی خاص بیان نہیں۔

۱۴۔ افغانستان جنگ کا ذکر اے غزالِ شب میں سقوط کے اسباب کی صورت پیش ہوا ہے جبکہ گمان میں دیوار برلن کی طرح افغان جنگ کا تذکرہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔

حوالہ جات

(۱) ارشد وحید، گمان، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۳

(۲) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۵

(۳) ارشد وحید، گمان، ص ۲۵

(۴) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص ۷، ۸

(۵) ارشد وحید، گمان، ص ۳۱

(۶) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص ۸

(۷) ارشد وحید، گمان، ص ۳۴

(۸) مستنصر حسین، تارڑ اے غزالِ شب، ص ۸

(۹) ارشد وحید، گمان، ص ۳۷

(۱۰) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص ۹

(۱۱) ارشد وحید، گمان، ص ۴۳

(۱۲) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص ۱۰

(۱۳) ارشد وحید، گمان، ص ۶۶

(۱۴) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص ۱۲

(۱۵) ارشد وحید، گمان، ص ۶۷

(۱۶) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص ۱۲

(۱۷) ارشد وحید، گمان، ص۱۰۶

(۱۸) ایضاً، ص۶۶

(۱۹) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۱۴

(۲۰) ارشد وحید، گمان، ص۱۳۹

(۲۱) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۱۵

(۲۲) ارشد وحید، گمان، ص۱۴۸

(۲۳) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۱۶

(۲۴) ارشد وحید، گمان، ص۱۵۰

(۲۵) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۲۱

(۲۶) ارشد وحید، گمان، ص۱۶۱

(۲۷) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۲۳

(۲۸) ارشد وحید، گمان، ص۲۰۰

(۲۹) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۲۶

(۳۰) ارشد وحید، گمان، ص۲۴۷

(۳۱) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۵۲

(۳۲) ارشد وحید، گمان، ص۲۶۴

(۳۳) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۶۴

(۳۴) ایضاً، ص۶۵

(۳۵) ارشد وحید، گمان، ص۳۲۳

(۳۶) ایضاً، ص۲۰

(۳۷) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۳۷

(۳۸) ارشد وحید، گمان، ص۱۷

(۳۹) ایضاً، ۲۷۵، ۲۷۶

(۴۰) مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، ص۸۱

ماحصل

کارل مارکس یورپ کا ایک عظیم مفکر ہے جس کے نظریات نے دنیا میں بھونچال پیدا کر دیا تھا۔لیکن اگر کارل مارکس کے نظریات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف عیاں ہوگی کہ یہ سب نظریات ایک دم سے کارل مارکس کے ذہن میں نہیں آئے تھے۔سماج میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے محرکات بہت اہم تھے جن کا جائزہ کارل مارکس ایک طویل عرصے سے لے رہا تھا۔ایک طویل عرصے کی غور وفکر کو اشتراکیت کا نام دیا گیا۔

یورپ کی تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کے بعد ہی یورپ میں سرمایہ داری نے سر اٹھایا۔اس کے بعد ہی یہ سوال اٹھا کہ آخر طبقاتی نظام کس طرح پیدا کیے جاتے ہیں۔کس طرح ذرائع پیداوار پر تصرف کیا جاتا ہے ایسے ہی سوالات نے اشتراکیت میں سائنسی انداز فکر کو جنم دیا اور اس سب کو بیان کرنے اور محفوظ کرنے کے لیے کارل مارکس نے داس کیپیٹل لکھی جس کو دنیا کی عظیم کتابوں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے اور جس کی اہمیت مستحکم ہے۔

کارل مارکس کے نظریات کا سب سے پہلے اثر روس کے لوگوں پر ہوا اور اسی نتیجہ میں سب سے پہلے روس میں ہی انقلاب آیا جس کو سرمایہ دار ملکوں نے اپنی سرمایہ داری کے لیے خطرے کی گھنٹی قرار دیا۔کارل مارکس کے نظریات نے تیسری دنیا کے تمام مزدوروں اور استحصالی طبقے کو متحد کر دیا۔کارل مارکس کے یہ ایسے نظریات تھے جس نے دنیا کے تمام ادب کو متاثر کیا اور ہندوستان کے مشہور ادیب وشاعر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

کارل مارکس سے پہلے بھی کسی نہ کسی شکل میں مفکروں نے مساوی اور مثالی معاشرے کی قیام پر نظریات دیے ہیں جن میں دولناخ،گراکس،مشارل فورتیے،نکولائی چرنی میومنکی قابلِ ذکر ہیں ۔لیکن کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز نے اس کو باقاعدہ ایک عظیم تحریک کی صورت دی۔

سائنسی ترقی بھی اپنی راہ ہموار کرتی گئی اور پھر ایک وقت ایسا آیا جس نے باقاعدہ صنعتی انقلاب کی راہ ہموار کردی جس کے نتیجہ میں یورپ میں بڑی بڑی مشینیں آگئیں۔اب جو کام کئی دنوں میں ہوتا تھا البصرف چند گھنٹوں میں ہونے لگا۔جو کام پہلے بہت سے آدمی مل کر کرتے تھے اب وہ ہی کام ایک مشین کے ذریعے ہونے لگا۔سائنس کے سبب ہی یورپ میں فرسودہ خیالات ختم ہونے لگے۔اس کے بعد ایک سے ایک مشین ایجاد ہونے لگی۔آوک رائٹ نامی شخص نے سوت کاتنے کی مشین ایجاد کی،چمز واٹ نے ذخانی انجن ایجاد کیا،سموئل مورس نے برقی تار ایجاد کیا اور اس کے بعد دنیا کے دوسرے ملکوں میں کپڑے کے بڑے بڑے کارخانے بننے لگے۔

اس باب میں اس بات کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ آخر پھر وہ کونسے عوامل تھے جن کی بدولت اس عظیم تحریک کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ جب اس پر بات کی جاتی ہے تو ایسے بہت سے عناصر ہماری بحث کا موضوع بنتے ہیں جن کی بدولت اس تحریک کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ایسے عناصر میں جوزف سٹالن کی آمریت، سخت ترین نوکر شاہی اور گورباچوف کی نئی اصلاحات نے اس عظیم تحریک کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

جاگیردار نظام صدیوں تک دنیا میں رائج رہا اور یہ بات واضح ہے جب کسی جگہ کوئی نظام مدتوں قائم رہے تو اس نظام کے اثرات اس معاشرے کی روایات اور اقدار پر مرتب ہوتے ہیں۔ تاریخ انسانی پر نظر ڈالی جائے تو روسو کی یہ بات درست ثابت ہوتی ہے کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جہاں دیکھو پابند سلاسل ہے''۔

تہذیبِ انسانی ایک خاص عرصے کے بعد سماج میں تشکیل پاتی ہے اور کسی تہذیب کو کسی معاشرے میں پاؤں جمانے کے لیا یک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے اور اس تہذیبی عمل کے رائج ہونے یا عمل پذیری کے دوران انسانی بقا اور بہتری کے لیے مختلف اصول اور قوانین بنائے جاتے ہیں۔ اس عمل کے دوران پرانی اقدار سے ہٹ کر نئے نظریات کو لاگو کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن ایسا معاشرہ جس کے افراد اس معاشرے کی پرانی روایات سے جڑے رہتے ہیں عافیت سمجھتے ہیں ان کے ذہنوں اور سوچوں میں خوف تہذیب کی شکل میں اختیار ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر نئے نظریات کو قبول کر لیا جائے ان کے قدیم نظریات اور روایات کی عمارت مکمل طور پر منہدم ہو رہ جائے گی۔ ایسے میں معاشرے کے لوگ اپنی پرانی روایات کے ساتھ ہی زمانے کے بدلتے حالات میں دفن ہو کر رہ جاتے ہیں۔

کچھ دانشمند بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں انسانی بقا اور بہتری کے لئے نئے نظریات پسند کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک نظریہ کارل مارکس نے بھی دیا جس کے نزدیک کائنات کی ہر شے جدلیاتی مادیت کے عمل سے دوچار ہے اور اس عمل کے نتیجے میں تضادات جنم لیتے ہیں اور تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے گو کہ جدیاتی مادیت کے فلسفے کی ابتدا ہیگل سے ہوئی مگر کارل مارکس نے اس کے نظریات کو مختلف اشکال اور روپ میں ڈھالا۔

یورپ میں صنعتی انقلاب نے سرمایہ دارانہ نظام کی راہیں ہموار کیں اور طبقاتی نظام کی کشمکش پیدا ہوئی ایسے میں اس کشمکش کو ختم کرنے کے لئے یا کم کرنے کے لئے ایک معاشرے کی ضرورت تھی جو طبقات سے بالاتر ہو اور جس میں بنی نوع انسان کی رسائی ان کے بنیادی وسائل تک ممکن ہو۔ اس نظام کے تحت محنت کا معاوضہ منافع میں

برابر کی صورت میں ہونا چاہیے۔انہیں عوامل کی بنا پر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو روس میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے اس انقلاب کے نتیجے میں ایک ایسی حکومت وجود میں آتی ہے جو ذاتی مفادات اور نفع سے بالاتر تھی۔لیکن انسانی نفسیات کے مشائدے سے معلوم ہوتا ہے انسان فطری طور پر طاقت حاصل کرنے اور اسے دوسروں پر آزمانے کا قائل رہا ہے۔جب یہ طاقت ور ہوتا ہے تو اپنے سے کمزور پر ظلم کرتا ہے، جب بااختیار ہوتا ہے تو بے اختیار پر، جب حاکم ہوتا ہے تو رعایا پر، جب آقا ہوتا ہے تو غلاموں پر، جب زمیندار ہوتا ہے تو مزاروں پر، جب کارخانے دار ہوتا ہے تو مزدوروں پر، جب آفسر ہوتا ہے تو ماتحتوں پر اپنی طاقت کا بے جا استعمال کر کے مظلوموں کا استحصال کرتا ہے اور اس کی مظلومیت اور بے بسی کا لطف اٹھاتا ہے۔اکتوبر انقلاب ۱۹۱۷ء جو نفع ونقصان اور ذاتی مفادات سے بالا تر تھا لیکن حکومتی اداروں میں ہی ''ون پارٹی رول'' غیر جمہوری طریقہ حکومت نے اس ۸۰ سالہ آہنی دیوار کو کھوکھلا کر دیا۔اس کے ساتھ ساتھ سرد جنگ اور روس کی جنگی ترجیحات کے نتیجے میں انقلاب کو اصل مقصد پشت پر چلا گیا۔انقلاب روس کے بعد آزادی اظہار کی دقروں پر سخت پابندی عائد تھی جس کے ردعمل کے نتیجے میں دانش مند احساس اور تخلیقی لوگوں میں بے چینی کا در آنا لازمی امر تھا۔چنانچہ ان حالات میں سرمایہ دارانہ پولکے شدید حملے روس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

دنیا کے دوسرے ادب کی طرح اُردو ادب پر بھی اس تحریک کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔بیسویں صدی میں لکھے جانے والے اُردو ناول اس بات کا ثبوت ہیں۔جن میں اس تحریک کو تخلیقی اظہار کا موضوع بنایا ہے۔

ارشد وحید کا ناول گـــــمـــــان بھی اسی حقیقت کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔گمان کا موضوع مارکسی تصورات، پاکستانی سماج میں اس تحریک کا عروج وزوال، نظریاتی کشمکش اور ایک مثالی معاشرے کا خواب اس ناول کا موضوع ہے۔گـمـان میں مصنف نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۹ء تک کے پاکستانی سماج کی تصویر پیش کی ہے۔یہ تحریک استحصالی نظام میں پسے ہوئے طبقے کی تحریک تھی جنہوں نے اپنے خوابوں میں ایک جنت بسا رکھی تھی اور اس جنت کے قیام کی منتظر تھے۔اس ایک خواب کے لیے ان محکوم اور نادار لوگوں نے بہت بڑی قربانی دی تھی لیکن بدقسمتی سے یہ تحریک بہت سے مسائل سے دوچار ہو کر اپنے انجام کو پہنچی۔اس ساری داستان کا احوال ارشد وحید نے اپنے ناول گمان میں نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

ناول میں مارکسی تصورات کے ساتھ ساتھ ہماری سیاسی تاریخ کے کئی گوشوں کو بھی بیان کیا ہے۔گمان کا ایک

پہلو ۱۹۶۰ء کے دور سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ سیاسی تاریخ میں یہ دور صدر ایوب کے دورِ حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ صدر ایوب کے دور میں اُس وقت حالات زیادہ خراب ہو گئے جب صدر ایوب نے ذوالفقار علی بھٹو کو وزارتِ خارجہ سے الگ کر دیا۔ لیکن بھٹو کی سیاسی کرشماتی شخصیت کے آگے بچارے صدر ایوب کی کیا حیثیت تھی۔

مارکسی تصورات کے ساتھ ساتھ گمان میں ۱۹۷۱ء کی پاکستان اور بھارت کی جنگ کو بھی ارشد وحید نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس جنگ کا آغاز ہوا تو بہت سے مارکسی کردار دفاعی کمیٹی میں شامل ہو جاتے ہیں اور دن رات بلیک آؤٹ کی نگرانی کرتے ہیں۔ لیکن ان کرداروں کو اس وقت بہت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب انہوں نے اپنے کانوں سے اپنے ریڈیو پاکستان سے پاک فوج کے ہتھیار ڈالنے کی خبر سنی۔

گمان میں ۱۹۷۰ء کے انتخابات کو بھی ناول کے پلاٹ کا حصہ بنایا ہے۔ یہ دور ہماری سیاسی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور ہمارے ناخواندہ لوگ بھی ماضی کی اس تاریخ سے خوب واقف ہیں۔ اس انتخاب کے بعد عوام نے حکومت سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لیں اور ان کے پورا نہ ہونے پر مایوسی کا شکار ہو کر رہ گئے۔

گمان کا بڑا حصہ مارکسی تصورات، بائیں بازو کی تحریک، اور پاکستانی سماج کی تاریخی کی عکاسی کی ہے۔ گمان میں کبیر، مرتضٰی، کمال، جبار، فہمیدہ، عفت، ظفر سلیم، محمد علی اور شہریار کا تعلق بائیں بازو کی تحریک سے ہی ہے۔ ان کی اس تحریک سے وابستگی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے مختلف گاؤں دیہاتوں اور شہروں میں مختلف سٹڈی سرکل بنا رکھے ہیں جہاں یہ کردار اپنے مارکسی تصورات کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے خواب کو پورا کرنے کے لیے نئے نئے پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔

اے غزالِ شب مستنصر حسین تارڑ کا اہم موضوعاتی ناول ہے۔ ناول کا عنوان ن م راشد کی نظم سے ماخوذ ہے۔ ناول آغاز اس نظم سے شروع ہوتا ہے۔ یہی تکنیک قراۃ العین حیدر نے اپنے ناول آگ کا دریا میں استعمال کی ہے۔

ناول کا آغاز آک کے ڈوڈوں سے نکلنے والے سفید گول اُڑنے والے روئی کے ریشوں سے ہوتا ہے جو ظہر الدین انقلابی کی کار سے ٹکراتے ہیں۔ ناول کے اس حصہ، میں مستنصر حسین تارڑ نے فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی ہے۔

ناول کا اہم کردار ظہرالدین ہے جس کو اپنے سرخ سویرا کے خواب کے پورے ہونے کا مکمل یقین ہے۔سرخ سویرا کا نظریہ ان کے جسم و جاں کا حصّہ ہے۔ظہرالدین ایک ایسا کردار ہے جو اپنے خواب کی تکمیل کے کیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔اس کو نہ تو کسی قیمت پر اس نظریے سے ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو خریدا جا سکتا ہے۔اس ناول میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ سوویت یونین کے وقت جو حالت اس کردار کی ہوتی ہے وہی حالت اس تحریک کی ہوتی ہے۔ظہرالدین نے اپنے اس نظریے کی خاطر اپنے تمام گھر والوں کو تیاگ دیا تھا۔

پاکستان میں اس تحریک کو مقبول کرنے میں سوویت یونین کا سفارت خانہ بہت اہم کردار ادا کر رہا تھا دوسرے ملکو ں کے انقلابیوں کے لیے سوویت یونین کے سفارت خانے نے اپنے خزانے کا منہ کھولا ہوتھا۔ایسے انقلابیوں کی ہر جائز و نا جائز خواہش کو پورا کیا جاتا اور ان کی نالائق اولادوں کو ماسکو یونیورسٹی بھیجا جاتا۔جن میں اپنے ملک مین پڑھنے کی استعداد نہ تھی اُن کو ماسکو کے اہم اور مہنگی یونیورسٹی میں داخلہ دے کر اپنے کیے ایسے عنوانات منتخب کرتے جو ان کی سمجھ سے بھی بالاتر تھے۔

لیکن یہ انقلاب زیادہ دیر تک مستحکم نہ رہ سکا اور ایسے یک دم ڈھیر ہوا کہ اس کے چاہنے والوں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور ایسے کرداروں کی حالت نا قابلِ بیان ہوگئی تھی بلکہ یہ لوگ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے عبرت کی مثال بن کر رہ گئے کہ ہمیشہ سوچ سمجھ کر کسی نظریے یا تحریک میں شامل ہونا چاہیے ہے اپنے آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہیے۔آخر میں اس کا احساس کرداروں کو بخوبی ہو جاتا ہے اور یہ بات اچھی طرح سے ان کو عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمارے اصل مجرم ہمارے ترقی پسند شاعر اور دانشور ہیں جنہوں نے ہمیں زندہ جلا ڈلا۔

مارکسی کرداروں نے اس تحریک میں اپنا سب کچھ تیاگ دیا تھا ان کے پاس مناسب زندگی گزانے کے لئے بھی کچھ نہ بچا۔ان کرداروں کی اولاد کو جو کام بھی میسر آئے وہ اس کو بغیر شرم و حیا محسوس کرتے ہوئے کرنے لگے۔ظہیرالدین کی بیٹی سویٹ لانا اپنے جسم کا برہنہ ڈانس دکھا کر اپنی روٹی روزی کمانے لگی اور اب اس کے پیسوں سے اس کی بیمار ماں کا علاج ہونے لگا اور انہی پیسوں سے ان کے گھر کا خرچ چلنے لگا۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد سرمایہ داری کا ایسے ظہور ہوا جس نے زندگی کے معنی ہی بدل کر رکھ دیے۔اب بڑے بڑے شاپنگ ہال بننے لگے۔جو جگہ پہلے ویران پڑی تھی اس پر اب شاندار پلازے بن گئے تھے۔ایسے میں جو کردار گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کے ماہر تھے وہ بھی سرمایہ داری کرنے لگے چاہے یہ سرمایہ داری

نسوانی بدنوں کی ہی کیوں نہ ہو۔اس کی واضع مثال قادر قریشی ہے جو اپنے اس برے کام کو بھی اسلامی باتوں سے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس لحاظ سے اے غـــزالِ شـــب کا موضوع بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں مارکسی تصورات اور واقعات کو تاریخی حقائق میں بیان کیا گیا ہے جس کی ایک اہم ضرورت بھی تا کہ لوگ اس فریب سے آشنا ہوں۔

دونوں ناولوں کا تقابل اس لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے دونوں ناولوں کا موضوع ایک ہے دونوں ناولوں میں مارکسی تصورات کو بیان کیا گیا ہے۔ گـمـان میں پورے سوویت یونین کی شکست کی بجائے صرف چند کرداروں کی شکست کو موضوع بحث بنایا ہے۔جبکہ اے غزالِ شب میں پورے سوویت یونین کی شکست کو بیان کیا ہے۔اے غـزالِ شـب میں پاکستانی کرداروں کو سوویت یونین کی سرزمین اور رشین کرداروں کو پاکستانی سر زمین پر بستے دکھایا ہے یہ خاصہ ہمیں صرف مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں واضع طور پر پڑھنے کو ملتا ہے۔دونوں ناولوں میں صدر ایوب اور صدر ضیاء الحق کے دورِ حکومت کو بھی موضوع بنایا ہے۔اے غـــزال شـــب میں جہاں سوویت یونین کے سفارت خانے کے کردار کو بھی موثر طور پر بیان کیا ہے۔دونوں ناولوں میں مارکسی تصورات کے ساتھ ساتھ پاکستانی سماج کو بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ دونوں ناولوں میں سوویت یونین کی شکست کو بیان کیا ہے۔ اس لئے ان ناولوں کا تقابل ضروری تھا۔

کتابیات

۱۔ ارشد وحید، گمان، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

۲۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر فقیر حسین (مرتبین) اُردو ناول کا ارتقا، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۴ء

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۲۰۱۳ء

۴۔ ایچ جی ویلز، مختصر تاریخِ عالم، مترجم: محمد عاصم بٹ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۰ء

۵۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، جدید اُردو فکشن: عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات، سانجھ، لاہور، ۲۰۱۰ء

۶۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، بر صغیر میں اُردو ناول، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء

۷۔ سجاد ظہیر، مارکسی فلسفہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء

۸۔ سید سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، سمیع پریس، کراچی، ۲۰۱۶ء

۹۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اُردو ادب کی صورت حال، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

۱۰۔ صفدر رشید، فنِ ترجمہ نگاری (مرتب) پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

۱۱۔ ظ۔ انصاری، ڈاکٹر، لینن سوانح عمری، بک ہوم، لاہور، ۲۰۱۵ء

۱۲۔ علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقات لاہور، ۲۰۱۳ء

۱۳۔ علی عباس جلالپوری، خرد نامہ جلالپوری، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۲ء

۱۴۔ فریڈرک اینگلز، خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۷ء

۱۵۔ کوثر نیازی، مولانا، دیدہ ور: ذوالفقار علی بھٹو، احمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

۱۶۔ لیوہیو برمین، یورپ امیر کیسے بنا، مترجم و تلخیص: عبداللہ ملک، نگارشات، لاہور، ۲۰۰۰ء

۱۷۔ مارکس، کمیونسٹ سماج، مترجم: امیر اثر خان، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۷ء

۱۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کے بدلتے نظریات، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

۱۹۔ محمد افضال بٹ،، ڈاکٹر، اُردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، سن ۲۰۰۹ء

۲۰۔ مستنصر حسین تارڑ، اے غزالِ شب، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، سن ۲۰۱۳ء

۲۱۔ منتظر مہدی، ڈاکٹر، ترقی پسند اُردو ناول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء

۲۲۔ یوسف خان رانا، اشتراکیت کے چند نظریاتی پہلو سماجی ارتقا، سرخ پرچم، پبلی کیشنز، حیدر آباد، ۲۰۱۷ء